نخل

قیمت فی کاپی ۱۰ار

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی

انجیلِ انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۶۷۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنے (معہ) علاوہ محصول

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت تین روپیہ
علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسنِ بیان قدرتِ بیان اور پاکیزگیٔ خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت چار روپیہ
علاوہ محصول

حُسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جسمیں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز تین حصوں میں

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاستِ بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل نئی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوئی ہے

قیمت حصہ اول و دوم فی حصہ تین روپیہ، حصہ سوم چار روپیہ
علاوہ محصول

زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دنیا آجکل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ، مشکی قوام، دانہ الائچی، تیل، عطر، عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام:۔ "مشکی قوام ہوڑہ" ٹیلی فون:۔ "ہوڑہ ۴۵۵"

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری۔ ۱۴۱ ہوڑہ روڈ۔ ہوڑہ

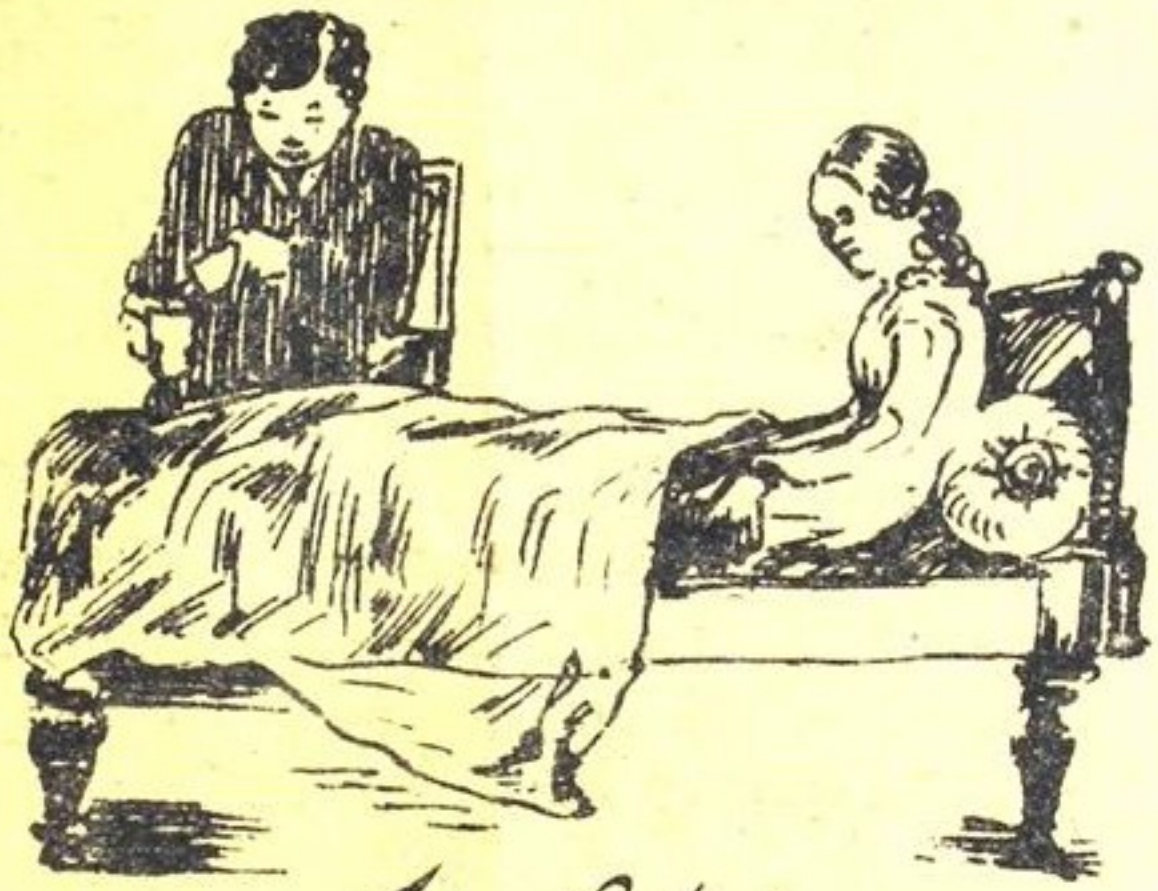

بُخار کا صحیح علاج کرو

زہر نہ پیو

موسمی بُخاروں اور ملیریا کی بدیسی دوائیں ہمارے مزاجوں کے موافق نہیں آتیں۔ یہ ہمارے لئے زہر ہیں، دل و دماغ پر بُرا اثر کرتی ہیں، اُن سے چہرہ زرد ہو جاتا ہے، یرقان کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور بعد کے اثرات بڑے ہی خطرناک ہوتے ہیں۔

لرزین موسمی بُخاروں اور ملیریا کا حکمی علاج ہے تمام دیسی اور بدیسی دواؤں کو مات کرتی ہے۔ بُخار کی حالت میں دل کی طاقت قایم رکھتی ہے اور بہت جلد پوری پوری شفا بخشی ہے **لرزین** سے بہتر علاج اور کوئی نہیں ہے۔ آپ زیادہ روپیہ خرچ کر سکتے ہیں۔ مگر **لرزین** سے بہتر دوا نہیں خرید سکتے۔ آج ہی طلب فرمائیے۔

قیمت:۔ فی شیشی نوخوراک ایک روپیہ آٹھ آنے

نوٹ:۔ دواؤں کی تازہ فہرست طلب فرمائیے

حمدرد دواخانہ لیبوریٹریز لال کنواں دہلی

Hamdard

DAWAKHANA LABORATORIES

"ہوم میڈیکل سروس" (گھر گھر علاج کی تنظیم)

قومی اور انفرادی دونوں نقطہ ہائے نظر سے اسوقت سب سے بڑا مسئلہ ہمارے سامنے یہی ہے کہ بڑھتی ہوئی عام بیماریوں کی کیونکر روک تھام کی جائے جن سے ملکی شرح اموات میں اضافہ، قوتِ پیداوار میں کمی اور عام طور پر گھروں کی فطری شادمانی، پریشانیوں اور اخراجات کی نذر ہو رہی ہے۔

اس اہم ترین مسئلہ کو حل کرنے کے لئے "ہوم میڈیکل سروس" نے عام خاندانی اور دیہاتی علاج کی ایک زبردست تنظیم قایم کی ہے جس کے تحت پانچ قابل ڈاکٹر وید اور حکیموں نے لفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر جی ٹی برڈوڈ سابق سول سرجن لکھنؤ و پرنسپل میڈیکل کالج آگرہ اور ملک کے نامور معالجین کے مجوزہ نسخہ جات سے، اپنے ہی ملک کی پیدا شدہ ادویات پر مشتمل ایسی مفید اور شفا بخش دواؤں کے بکس تیار کئے ہیں جو روزمرہ کی تمام بیماریوں کو کم سے کم وقت میں دور کر دیتے ہیں اور خرچ کے لحاظ سے ایک خوراک کی قیمت عموماً ایک پیسے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جدید ترین میڈیکل سائنس اور مشینوں کے ذریعہ انھیں نہایت قلیل المقدار اور انتخاب و استعمال میں نہایت آسان اور ہر لحاظ سے غیر مضر بنا دیا گیا ہے۔

فیملی بکس :- جس میں بخار، بدہضمی، درد، کھانسی، زکام نزلہ، قبض، پیچش اور جلدی بیماریوں کی آٹھ نہایت زود اثر دوائیں ایک ایک اونس کی سربمہر شیشیوں میں عموماً ٹیبلیٹس (ٹکیوں) کی شکل میں محفوظ ہوتی ہیں معہ کتاب ہدایات تین روپیہ بارہ آنے میں ملتا ہے۔

اسکیبنر (خارش) بکس :- اس دبائی مرض کے ازالہ کے لئے صفائی خون اور بیرونی علاج کی الگ الگ دو شیشیاں، ایک روپیہ میں ملتی ہیں۔

بے بی بکس :- چھوٹے بچوں کی تمام عام شکایات کی مخصوص دواؤں کا مکمل بکس، جو اپنے قطعی غیر مضر اثرات، مقدار خوراک اور ذائقوں کے لحاظ سے ایک مثالی پیشکش ہے۔ کل تین روپے میں ملتا ہے۔

ویمنیز (زنانہ) بکس :- خواتین کی مخصوص چھ شکایات کے لئے چھ سربمہر شیشیوں کا سٹ، جو بے زبان اور باحیا بہنوں کے لئے پیغام راحت ہے اور جس سے وہ خود اپنی صحت کو گھن لگا دینے والی بیماریوں کا بعجلت اور شافی علاج کر سکتی ہیں، معہ کتابچہ ہدایات، تین روپے۔

تفصیلی لٹریچر اور ہر بیماری میں ماہرانہ مشورہ، جوابی خط آنے پر بلا معاوضہ بھیجا جاتا ہے۔

مینجر 'ہوم میڈیکل سروس'
صدر دفتر:- بکٹ نراین روڈ، لکھنؤ

دس ہزار روپیہ مفت انعام

امرتسر میں سونا تین روپیہ تولہ

جو کوئی نیچے لکھی ہوئی باتوں کو جھوٹا ثابت کر دے اس کو دس ہزار روپیہ مفت انعام دیا جائے گا۔

جس گھر میں یہ سونا گیا وہاں سے دوبارہ تبارہ فرمایش آئی

بابو لالہ منشی رام جی کلاتھ مرچنٹ دھرم سالہ سے لکھتے ہیں کہ "آپ کا سونا امریکن نیو گولڈ بارہ تولہ کا پارسل ملا۔ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ نیو گولڈ اور اصلی سونے میں کوئی فرق نہیں — آپ نے اس چیز کو طیار کر کے دنیا کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے — بارہ تولہ سونا بوا پسی بھیجدیجئے، بعد میں اور بھی آرڈر دیا جائے گا۔ یہ سونا کسوٹی پر اصلی سونے کا رنگ دیتا ہے، اصلی سونے کی طرح کوٹا اور پگھلایا جا سکتا ہے۔ ہر قسم کے زیورات بنائے جا سکتے ہیں جنکو ہوشیار سے ہوشیار صراف بھی مشکل سے پہچان سکتا ہے"— مشہور کرنے کے لئے قیمت فی تولہ تین روپیہ تین تولہ کی قیمت آٹھ روپیہ۔ چھ تولہ کی قیمت پندرہ روپیہ۔ بارہ تولہ کی قیمت اٹھائیس روپیہ

ضروری نوٹ :- ہر تین تولہ کے خریدار کو دو بمبئی فیشن کی انگوٹھیاں مفت دیجائیں گی، چھ تولہ کے خریدار کو دو بمبئی فیشن انگوٹھیاں ایک جوڑ کانٹے اور ایک جوڑ چوڑی مفت دی جائیں گی۔ بارہ تولے کے خریدار کو ایک لاکٹ معہ چین، دو جوڑ چوڑی، دو بمبئی فیشن انگوٹھیاں مفت دیجائیں گی اور محصول ڈاک بھی معاف ہوگا۔

مال پسند نہ آنے پر قیمت واپس کی جاتی ہے — جلد منگوائیے ورنہ یہ وقت پھر ہاتھ نہ آئے گا۔

ملنے کا پتہ :- **نیو گولڈ سپلائی کمپنی (N.L) حلقہ نمبر ۲۲ - امرتسر**

"نگار" کا آیندہ سالنامہ
جو جنوری ۵۰ء میں شایع ہوگا

جنوری ۵۰ء میں نگار کی عمر پوری ۲۹ سال کی ہو جائے گی اور اس زمانہ میں اس نے جتنی علمی و ادبی خدمات انجام دی ہیں، ان کا جایزہ مختلف پہلوؤں سے لیا جا سکتا ہے، لیکن ان سب میں شاید سب سے زیادہ اہم پہلو اس کی تنقیدی خدمات کا ہے۔

نگار ہی سب سے پہلا اُردو کا رسالہ تھا جس نے جدید اُصول کو سامنے رکھ کر تنقید کا آغاز کیا اور یہ سلسلہ اسوقت تک قایم ہے۔ پھر اس کی تنقید کا دائرہ یوں تو علم و مذہب، اور تاریخ و سیاست تک وسیع تھا، لیکن خصوصیت کے ساتھ ادب کے سلسلہ میں اس نے جتنی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اس کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر نہ کیا جائے اور اسی خیال کو سامنے رکھ کر، بعض اکابر ادب کے اصرار پر ہم نے ارادہ کیا ہے کہ آیندہ سالنامہ صرف ان تنقیدی مقالات کے اقتباس و انتخاب پر مشتمل ہو، جو اس وقت تک اساتذۂ فن کے قلم سے نگار میں شایع ہو چکے ہیں۔ یہ مجموعہ دنیائے ادب میں کس قدر مفید ثابت ہوگا، اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے، جس نے نگار کا التزام کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ اس مجموعہ کی ضخامت کا اندازہ کم از کم تین سو صفحات کیا جاتا ہے اور ہم کوشش کریں گے کہ یہ اسی سال کے اختتام تک طیار ہو جائے اور جنوری ۵۰ء کے پہلے ہفتہ میں شایع ہو جائے۔ خریداران نگار سے اس کی قیمت صرف ایک روپیہ زاید لی جائے گی لیکن غیر خریداران نگار کو چار روپیہ میں مل سکے گا۔

منیجر نگار لکھنؤ

رعایتی اعلان

(۱) شہوانیات — مکتوبات سوم — مالہ و ماعلیہ

چار روپیہ — چار روپیہ — دو روپیہ

گوہر — مذہب — مجموعہ استفسار جلد سوم

ایک روپیہ — ایک روپیہ — تین روپیہ

ان کتابوں کی قیمت علاوہ محصول پندرہ روپیہ ہوتی ہے لیکن اگر آپ سب ایک ساتھ طلب فرمائیں گے تو معہ محصول صرف بارہ روپیہ لئے جائیں گے۔

(۲) **ماجدولین نمبر** - رومان و افسانہ کی دُنیا کا بہترین شاہکار

قیمت ڈیڑھ روپیہ

فسانہ نمبر - بہترین فسانوں کا انتخاب - قیمت تین روپیہ

پاکستان نمبر - جو نگار کا جوبلی نمبر بھی ہے۔ اڈیٹر نگار کے علمی و تاریخی مضامین کا بیش بہا مجموعہ ہے - قیمت تین روپیہ

یہ تینوں خاص نمبر یکجا طلب کرنے پر معہ محصول چھ روپیہ میں مل سکتے ہیں۔

(۳) **من و یزداں** — شہوانیات — گوہر

سات روپیہ آٹھ آنہ — چار روپیہ — ایک روپیہ

مکتوبات نیاز حصۂ سوم — مالہ و ماعلیہ — قول فیصل

چار روپیہ — دو روپیہ — دو روپیہ

جن کی مجموعی قیمت بیس روپیہ آٹھ آنے ہوتی ہے - ایک ساتھ طلب کرنے پر صرف اٹھارہ روپیہ میں معہ محصول۔

(۴) **مذہب** — **ملک خطا کے شہزادے**

ایک روپیہ — بارہ آنے

فراست الید — **حکماء قدیم** — **شہاب**

ایک روپیہ — ایک روپیہ آٹھ آنہ — ایک روپیہ آٹھ آنہ

سب یکجا طلب کرنے پر معہ محصول چار روپیہ - **منیجر نگار لکھنؤ**

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۵۵	فہرست مضامین مارچ سنہ ۴۹ء	شمار ۳

ملاحظات ---------- ۵

ہندی اور عربی کے ہم معنی اشعار .. (شمس العلماء) محمد امین عباسی -- ۹

ترقی پسند ادب، ادب نہیں صحافت ہے ... ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ۲۵

منیند ---------- نسیم نعمانی ------ ۳۳

خان خاناں اور اسکی مدح .... نذیر احمد ام۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ۳۶

رامپور کا سرکاری کتب خانہ --- کلیم سہسرامی ----- ۴۵

یونیورسٹی سے لوٹتے ہوئے --- "رازداں" ---- ۴۹

جھگڑالو ------ پروفیسر رشید احمد صدیقی ----- ۵۳

سنگ راہِ زندگی (نظم) --- ساقی جاوید ----- ۵۷

انتخاب کلام بسمل سعیدی ہاشمی ---------- ۵۸

لذتِ غم (نظم) --- شفیق جونپوری ------ ۵۹

قطعات ... وسیم ـــ غزل --- اکرم ـ مہر ----- ۶۰

مطبوعات موصولہ ---------- ۶۱

مرثیہ نگاری اور میر انیس --- ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ ۶۵-۷۲ / ۲۵-۳۲

ملاحظات

سُرخ سایہ ہندوستان کی آزادی، اس میں شک نہیں، نہ صرف سرزمین ہند بلکہ تاریخ عالم کا اتنا اہم واقعہ ہے کہ کوئی مانے یا نہ مانے وہ اپنی اہمیت تسلیم کرائے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن یہ سوال بدستور اپنی جگہ قایم ہے کہ ہندوستان کی آبادی کو اس آزادی سے جو فایدہ اُٹھانا ہے اس کی نوعیت کیا ہوگی اور اسوقت تک جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے، اس کو دیکھ کر مستقبل کے متعلق کیا حکم لگایا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی سب سے بڑی بدقسمتی جس نے اسوقت تک اسے اُبھرنے نہیں دیا، اس کی کثرت آبادی اور اختلافِ مذاہب ہے۔ اگر اس کی آبادی ۴۰ کرور کی جگہ صرف دس کرور ہوتی یا یہاں صرف مسلمان ہی مسلمان یا ہندو ہی ہندو ہوتے، تو غالباً یہ ملک اس سے بہت پہلے آزاد ہو چکا ہوتا اور حصول آزادی کے بعد جو دشواریاں پیش آرہی ہیں وہ سامنے نہ آتیں۔ کیونکہ اتنی بڑی آبادی کو جسے پورے براعظم پر پھیلا ہوا ہونا چاہیئے تھا، کسی ایک خیال پر متفق کرنا اور اتنے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو جنھوں نے بربنائے جہل مذاہب کی اخلاقی اہمیت کو پس پشت ڈالدیا ہے، یہ باور کرانا کہ مذہب کی حقیقی رُوح صرف انسانیت پرستی اور اخوت عامہ ہی ہے، بہت مشکل تھا اور ہے ـــ جب تک انگریز یہاں حکومت

کرتے رہے، ہم نے ہمیشہ یہی سمجھا اور کہا کہ یہ اختلاف زیادہ تر انھیں کا پیدا کیا ہوا تھا (جو بڑی حد تک درست بھی ہے) لیکن اب کہ انکی حکومت ختم ہو چکی ہے اور ملک آزاد ہو چکا ہے ہم کو اطمینان و سکون کیوں نصیب نہیں ؟ — یہ اتنا اہم سوال ہے کہ نہ صرف حکومت بلکہ ہندوستان کی تمام آبادی کو اس پر غور کرنا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دُنیا میں سب سے زیادہ تلخ حقیقت جس کے سامنے مذہبی عقاید اور اصول اخلاق بھی اپنی سپر ڈال دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اقتصادی حقیقت ہے۔ جس کو حل کئے بغیر دنیا کی کوئی حکومت قایم نہیں رہ سکتی، اور بدقسمتی سے اس وقت اسی مسئلہ نے اتنی وسعت و پیچیدگی اختیار کر لی ہے کہ وہ "کرۂ ارض کا دردِ سر" ہو کر رہ گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس مسئلہ کا حل اگر کسی حکومت نے دریافت کیا ہے تو وہ روس کی اشتراکی حکومت ہے، اور اس کے ثبوت میں جو دلایل پیش کئے جاتے ہیں ان میں سب سے زیادہ وزنی دلیل یہی ہے کہ بالشویک حکومت نے بیروزگاری اور فقر و فاقہ کی مصیبت کو ختم کر دیا ہے اور اسی لئے وہاں نہ کبھی اسٹرائک ہوتا ہے نہ کوئی کارخانہ بند ہوتا ہے۔

ہم کو روس کے صحیح حالات کا علم نہیں ہے، لیکن یہ ضرور جانتے ہیں کہ اشتراکی تحریک ایک طرف یوروپ میں بھی پھیلتی جا رہی ہے اور دوسری طرف یہ سیلاب چین، ملایا، برما، انڈونیشیا کی طرف سے بڑھتا ہوا ہندوستان تک پہونچ گیا ہے۔ اس لئے قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اشتراکیت یا کمیونزم میں وہ کیا بات ہے جو لوگوں کو اپنی طرف مایل کر رہی ہے، آیا وہ کوئی ایسا سماجی قانون ہے جو پہلے سے وضع کر کے لوگوں پر عاید کیا جا رہا ہے، یا قدرتی نتیجہ ہے واقعات و حالات کا، جنھوں نے ازخود یہ صورت اختیار کر لی ہے۔

کمیونزم نام ہے اس احساس کا جو اقتصادی عدم توازن کی وجہ سے لوگوں میں پیدا ہوتا ہے اور اس عدم توازن کا احساس اسوقت بہت قوی ہو جاتا ہے، جب انسان اپنی روز کی ضروریات پوری کرنے پر بھی قادر نہیں ہوتا۔ پھر چونکہ ان ضروریات میں سب سے مقدم غذا کا سوال ہے، اس لئے جب کسی ملک میں یہ حالت پیدا ہو گی کہ اس کا ایک طبقہ ضرورت سے زیادہ دولت کا مالک ہوگا اور دوسرا بقدر کفاف بھی حاصل نہ کر سکے گا تو وہاں ضرور دولت و افلاس میں تصادم ہوگا اور اسی تصادم کا نتیجہ اسٹرایک، ہرتال، کمیونزم یا اشتراکیت ہے۔

پھر چونکہ جنگ کے بعد ساری دُنیا کا اقتصادی توازن درہم برہم ہو چکا ہے اور غذائی اشیاء کی گرانی نے انتہائی بھیانک صورت اختیار کر لی ہے، اس لئے قدرتاً یوروپ و ایشیاء میں ہر جگہ کمیونزم کو پھیلنا چاہئے۔

اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری اور دولت کی غیر متوازن تقسیم کے خلاف محنت کش طبقہ کا علم بغاوت کرنا بالکل درست ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آج دُنیا کی تمام دولت انسانوں میں برابر برابر تقسیم کر دیجائے تو کیا موجودہ اقتصادی دشواریاں دور ہو جائیں گی اور دُنیا کو امن و سکون نصیب ہو جائے گا۔ ایک کمیونسٹ اس کا جواب ہمیشہ اثبات میں دے گا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا یہ جواب صحیح نہ ہوگا۔

اگر دماغی و فطری افتاد کے لحاظ سے دُنیا کے تمام انسان ایک ہی اہلیت کے ہوتے تو البتہ یہ جواب صحیح ہو سکتا تھا، لیکن چونکہ یہ اہلیتیں مختلف ہیں اور اسی اختلاف نے دُنیا میں فرق مراتب و مدارج کے حدود قایم کئے ہیں، اس لئے نہ ہم ان فطری رجحانات کو روک سکتے ہیں اور نہ روکنا چاہئے، کیونکہ دُنیا میں علوم و فنون کی ترقیاں محض اسی اختلاف کے بدولت ہوئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ ہاں، اگر آج ہم دُنیا کے تمام

ترقی یافتہ مظاہر تمدن کو فنا کردیں، اور انسان کو یہ یقین دلا سکیں کہ زندگی کا مقصود صرف اتنا غلّہ پیدا کرلینا ہے کہ وہ اسے کھا کر زندہ رہ سکے، تو بیشک یہ تصادم دور ہو سکتا ہے، لیکن غالباً صرف چند دن کے لئے، کیونکہ اس عہد وحشت کی طرف لوٹ جانے کے بعد وہ پھر آگے قدم بڑھائے گا اور اس کی فطرت اسے نچلا نہ بیٹھنے دے گی۔

اس لئے اگر کمیونسٹ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کے تمام انسان ایک ہی سطح پر آجائیں اور فرق مراتب محو کر دیا جائے تو یہ ممکن نہیں، ایسا چاہنا فطرت کی مخالفت کرنا ہے اور انسان کو حیوانات کی سطح پر کھینچ کر لے آنا ہے۔

جن دماغوں نے ریڈیو، ہوائی جہاز، موٹر اور ٹیلی فون بنائے ہیں، وہ یقیناً عام دماغوں سے مختلف ہیں، اور ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ ہم ان کے معاشری مطالبات کو صرف اس اصول کی بنا پر رد کردیں کہ انسان ہونے کی حیثیت سے وہ اور ایک پتھر توڑنے والا مزدور دونوں برابر ہیں۔ بہرحال اگر کمیونسٹ یہ چاہتے ہیں کہ نوع انسانی کے تمام افراد ایک ہی طرح کی زندگی بسر کریں اور دولت سب میں برابر تقسیم ہو جائے تو ان کا یہ چاہنا بالکل غلط ہے، لیکن اگر انکا مطالبہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اسکی فطری صلاحیت کے لحاظ سے کام کرنے کے مواقع حاصل ہونا چاہئے، تو یہ مطالبہ محض اسٹرایک یا دہشت انگیزی سے پورا نہیں ہو سکتا — اس میں شک نہیں کہ مزدور اور کسان طبقہ کی حالت بہت کچھ اصلاح طلب ہے، لیکن اس اصلاح کا تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ وہ کام کم کریں اور اُجرت زیادہ چاہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ سوویٹ حکومت میں جس کی وہ پیروی کرنا چاہتے ہیں، ایک مزدور کو صرف ایک روٹی حاصل کرنے کے لئے دو گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے، برخلاف اس کے امریکہ میں جو ایک سرمایہ دار حکومت ہے، ایک مزدور صرف بارہ منٹ محنت کرکے ایک روٹی حاصل کرسکتا ہے، اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ زندگی کی دوسری ضروریات کے لئے روس کے مزدور کو کتنا کام کرنا پڑتا ہوگا — اگر کمیونسٹ جماعت یہ سمجھتی ہے کہ وہ سرمایہ داروں سے کارخانے چھین کر مزدوروں کی حالت کو بہتر بنا سکتی ہے تو یہ اسکی غلطی ہے، کیونکہ صنعتی ادارے صرف ہاتھ پاؤں اور سرمایہ سے نہیں چلتے بلکہ اس کے لئے خاص دماغوں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ کمیونسٹ جماعت کو حاصل نہیں ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ انگلستان کی موجودہ حکومت اپنے ملک کے صنعتی اداروں کو سرمایہ داروں کے ہاتھ سے لیکر، قومی ملکیت میں تبدیل کرنے سے اسی لئے قاصر رہی کہ نہ وہ اداروں کے چلانے کا تجربہ رکھتی تھی اور نہ ادنیٰ درجہ کے کاریگر اس کو مل سکتے تھے — ہمارے ملک کی کمیونسٹ جماعت، موجودہ حکومت کو نااہل سمجھتی ہے اور یقین کرتی ہے کہ اگر حکومت اسکے ہاتھ میں آجائے تو وہ موجودہ اقتصادی عدم توازن کو دور کرسکتی ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اس باب میں غلطی پر ہے، کیونکہ اس وقت سب سے بڑا سوال غلّہ کی گرانی کا ہے جس کو سامنے رکھ کر ہنگامے برپا کئے جاتے ہیں، اور اس کا حل کمیونسٹ جماعت کے پاس بھی نہیں۔ کیونکہ ہندوستان میں غلّہ کی کمی اور گرانی کا سبب صرف یہ ہے کہ اسکی پیداوار ہی کافی نہیں ہے۔ حصول آزادی سے قبل بھی انگریزوں کے زمانہ میں جب غلّہ دوسرے ملکوں سے آتا تھا تب کہیں جاکر کام چلتا تھا اور اب کہ باہر سے غلّہ کی درآمد بند ہو چکی ہے اور آبادی بھی بہت بڑھ گئی ہے، غلّہ کی کمیابی و گرانی کیونکر دور ہو سکتی ہے جب تک اس کی پیداوار نہ بڑھائی جائے اور یہ ایک دن کا کام نہیں — ہندوستان کی موجودہ حکومت پوری طرح قلت پیداوار سے واقف ہے اور پیداوار بڑھانے کی وہ کوشش بھی کر رہی ہے، لیکن افسوس ہے کہ یہ کوشش اب تک بارآور نہیں ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس مد میں اس نے کافی رقم صرف کی اور کر رہی ہے، لیکن وہ اس اسکیم کو اچھی طرح ارگنائز نہیں کرسکی اور اسکی تجاویز بہت کم عملی صورت اختیار کرسکیں — یقیناً حکومت اس باب میں اپنی ناکامی کے کافی وجوہ پیش کرسکتی ہے اور یہ بھی درست ہے کہ حکومت اور بے شمار الجھنوں کی وجہ سے اپنی پوری قوت اس مسئلہ پر صرف نہیں کرسکی، لیکن جب کسی ملک کی آبادی فقر و فاقہ میں مبتلا ہوتی ہے تو وہ کسی منطق و استدلال سے مطمئن نہیں ہو سکتی اور یہی بے اطمینانی کمیونسٹوں کے ہاتھ میں ایک بڑا زبردست ہتھیار ہے — ہندوستان میں اشتراکی تحریک پہلے بھی پائی جاتی تھی، لیکن اب اس میں زیادہ شدت ہوتی جاتی ہے اور مشرق کی طرف سے یہ "سُرخ سایہ" اتنی تیزی کے ساتھ بڑھتا آرہا ہے کہ اگر اس کا سدباب نہ کیا گیا تو ہندوستان کا بھی وہی حال ہوگا جو چین کا ہوا اور ملک قتل و خونریزی سے تباہ ہو جائے گا۔ لیکن یہ ملحوظ خاطر رہے کہ اس کا سدباب صرف فوج اور پولیس کی مدد سے نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے اشتراکیوں کے ہاتھ سے انکا ہتھیار چھین لینے کی اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب غذا کے مسئلہ کو حل کیا جائے۔

خوش آیند مستقبل پاکستان و ہندوستان کے درمیان خواہ کتنا ہی اختلاف ہو، لیکن اس حقیقت کو جلد یا بدیر تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ یہ دونوں ایک ہی جسم کے دو ایسے عضو ہیں، جو ایک دوسرے سے علٰحدہ ہو کر جسم کی حفاظت نہیں کر سکتے اور اصولاً ایک دوسرے کے ساتھ ملکر کام کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر کشمیر کا مسئلہ سامنے نہ ہوتا تو غالباً اس حقیقت کو بہت پہلے ہی تسلیم کر لیا جاتا، اور اب کہ اس مسئلہ کو پورے آئینی طور پر طے کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ ہمیں امید رکھنا چاہئے کہ پاکستان و ہندوستان کی باہمی کشش بہت جلد ختم ہو جائے گی ـــــ کشمیر، پاکستان میں شامل ہوگا یا ہندوستان میں، اس پر نہ رائے زنی کی ضرورت ہے نہ کسی پیش گوئی کی، کیونکہ اصولاً یہ بات طے پا گئی ہے کہ کشمیر کی آبادی جو فیصلہ کرے گی اس کو دونوں تسلیم کریں گے، اس لئے باہمی تعلقات کو زیادہ استوار کرنے کے لئے اس فیصلہ کے انتظار کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی اور بہت سے وہ سمجھوتے جو فیصلہ کے بعد اُٹھا رکھے گئے ہیں ان پر ابھی سے عمل شروع ہو جانا چاہئے اور تمام وہ علامتیں جن سے دونوں ملکوں کا ایک دوسرے کا حریف ہونا ثابت ہوتا ہے، انھیں فوراً مٹ جانا چاہئے۔ ان میں سے سب سے زیادہ مکروہ و تکلیف دہ چیز پرمٹ سسٹم اور ریل کے سلسلہ کا انقطاع ہے۔ ان موانع سے نہ صرف ہندوستان و پاکستان کے باشندوں کو تکلیف ہے، بلکہ دونوں حکومتوں کو بھی بہت سی دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ اگر دونوں ملکوں کے باشندے آسانی اور آزادی کے ساتھ اِدھر سے اُدھر آ جا سکیں تو شرنارتھیوں اور مہاجرین کے بسانے میں جو اُلجھنیں اس وقت پیدا ہو رہی ہیں وہ بڑی حد تک دور ہو جائیں گی اور بہت سے مسلمان پاکستان سے ہندوستان اور بہت سے ہندو، ہندوستان سے پاکستان چلے جائیں گے، جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان دونوں کے تعلقات پھر خوشگوار ہو جائیں گے اور اس طرح بہت سی معاشی و سیاسی گتھیاں از خود سلجھ جائیں گی۔

راشٹریا سنگھ اس دوران میں سب سے زیادہ اہم طبقاتی مظاہرہ، راشٹریا سنگھ کا تھا اور حکومت نے اس فتنہ کو جلد خاموش کر بھی دیا، لیکن ہم یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ وہ بالکل ختم ہو گیا ہے۔ حکومت ایک جماعت کے طریق کار کو تو ختم کر سکتی ہے، لیکن اصل تحریک کو ختم نہیں کر سکتی، جب تک اس جماعت کا اعتقاد (Creed) نہ بدل دے اور یہ موجودہ حکومت کے بس کی بات نہیں ـــــ راشٹریا سنگھ، ہندو راج کی علمبردار ہے اور وہ علانیہ اس کا اظہار کرتی ہے۔ ہماری حکومت غیر مذہبی ہونے کی مدعی ہے، لیکن اس کے افراد اپنے عمل سے اس کا ثبوت پیش نہیں کرتے اور اس طرح راشٹریہ سنگھ کے زہریلے درخت کی آبیاری اندر ہی اندر گویا خود حکومت کی طرف سے ہو رہی ہے۔ راشٹریا سنگھ کا مقصود ہندوستان کے مسلمانوں کو یہاں سے نکالدینا یا انھیں ذلیل و خوار رکھنا ہے اور اس کا جواب کانگریس اور حکومت کی طرف سے یہی ہونا چاہئے کہ وہ سنگھ کے اس مقصد کی عملی مخالفت کرے، جو قطعاً مفقود ہے ـــــ مسلمانوں سے حکومت کا ہر ہر قدم پر ان کی وفاداری کا ثبوت طلب کرنا اور راشٹریا سنگھ سے کبھی ایک بار بھی اس ثبوت کے طلب کرنے کی ضرورت نہ سمجھنا ـــــ اگر یہ ہندوستان کی غیر مذہبی حکومت کی کسی خاص مصلحت پر مبنی ہے، تو افسوس ہے کہ ہم اس کے سمجھنے سے عاری ہیں ـــــ مسلمانوں کا کلچر اجنبی، ان کی زبان غیر ملکی، سرکاری خدمتوں پر ان کی ماموری خطرناک، کاروبار میں ان کے لئے سہولتیں پیدا کرنا خلاف مصلحت، مذہبی شعائر میں ان کو پوری آزادی دینا یا کسی رواداری سے کام لینا نامناسب۔ لیکن راشٹریا سنگھ کو غیر آئینی اور امن شکن جماعت قرار دینے کے بعد بھی اس کے حامیوں کے خلاف جو خون کی طرح حکومت کی رگوں میں دوڑ رہے ہیں، کوئی مضبوط قدم نہ اُٹھانا، عین انصاف!

چشم اگر ایں ست و ابرو ایں و ناز و عشوہ ایں
الفراق اے ہوش و تقویٰ، الوداع اے عقل و دیں

کاش حکومت، راشٹریا سنگھ کے خلاف اس لئے قدم نہ اُٹھاتی کہ اس کی طرف سے ایوان حکومت میں زلزلہ پڑ جانے کا اندیشہ ہے، بلکہ محض اس لئے کہ وہ "دشمنِ انسانیت" جماعت ہے اور ایک ایسے طبقہ کو فنا کر دینا چاہتی ہے، جسکی نہ صرف حفاظت بلکہ ترقی و بہبود کی پوری ذمہ داری لینے کے بعد ہی وہ اپنے کو صحیح معنی میں "غیر مذہبی حکومت" کہہ سکتی ہے۔

ہندی اور عربی کے ہم معنی اشعار

مدت سے میرا خیال تھا کہ عربی اور ہندی برج بھاشا کے اُن اشعار کو جمع کروں جو ایک ہی جذبہ کا اظہار کرتے ہوں لیکن اس کے لئے جس قدر سامان اور وقت کی حاجت تھی اس کو میں بوجہ مشاغل کے مہیا نہ کرسکا۔ چونکہ میں نے اس کی بنیاد ڈالدی تھی اور چند اشعار اس موضوع پر جمع کئے تھے ان کو مولانا نیاز صاحب فتحپوری اڈیٹر نگار کی خواہش پر مع ایک مختصر مقالہ کے "نگار" میں طبع کے لئے بھیجتا ہوں۔

سنسکرت میں "ساہتیہ" (بلاغت) کا ایک حصہ "کاویہ" اشعار ہیں۔ فن بلاغت کی بنیاد جس کو سنسکرت میں (साहित्य) "ساہتیہ" کہتے ہیں، ۹۰۰ء سے پہلے قایم ہوچکی تھی۔ پانٹرنی (पाणिनि) اس کا موجد ہے جس نے سنسکرت کی صرف و نحو مرتب کی اور زبان کی تحقیق کی اور سنسکرت کا لغت مرتب کیا۔ میکسمولر کے خیال کے مطابق اس کا زمانہ ۳۵۰ء سے پہلے تھا۔ اس کا ثبوت وہ یہ دیتے ہیں کہ سوم دیو بھٹ کی کتاب کتھا سریت ساگر، پانٹرنی کے زمانہ میں لکھی گئی جس کا زمانہ ۳۵۰ء سے پہلے تھا، اسی زمانہ سے شاعری پر مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں اور شاعری نے بڑی ترقی کی۔

ہندو مصنفین میں یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے کہ کن چیزوں سے شعر کی حقیقت متعین ہوتی ہے اور شعر کی حقیقت کیا ہے؟ ہندو مصنفین نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ شعر کے لئے کسی جذبہ کا اظہار ضروری ہے ایسا کلام جس میں کسی جذبہ کا اظہار نہ ہو وہ شعر نہیں ہے۔ ڈاکٹر بین (Bain) اپنی تحقیق کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ "شعر کی تعریف میں ہم کو جذبہ کی طرف آنا ہی پڑے گا" دیگر تحقیق نے اس پر جو بحثیں کی ہیں وہ بھی قریب قریب اسی نقطہ پر آئے ہیں اگرچہ ان میں تھوڑا فرق ہے۔

ڈاکٹر بین نے جو جذبات کی تقسیم کی ہے اگر اس کا مقابلہ سنسکرت مصنفین کے خیالات سے کیا جائے تو خالی از دلچسپی نہ ہوگا سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیوں تمام لٹریچر میں جذبۂ غم زیادہ مرجح ہے، چنانچہ ہندی مصنفین کہتے ہیں کہ "ان تمام جذبات میں جو اشعار میں ظاہر کئے جاتے ہیں جذبۂ غم مرجح ہے" انگریزی مصنفین لکھتے ہیں:۔ "ہمارے گیتوں میں سب سے زیادہ شیریں وہ گیت ہیں جن میں سب سے زیادہ آلودہ خیالات کا اظہار کیا جائے" لیکن اب تک اس سوال کا جواب کسی محقق نے نہیں دیا اور نہ ممٹ (سنسکرت کا فاضل کوی) اس کی کوئی توجیہ پیش کرسکے بین اسی کے ساتھ یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ جذبۂ غضب۔ خوف اور نفرت کو شاعری میں کیوں جگہ ملنی چاہئے، ڈاکٹر نکس ماڈڈان نے اپنی کتاب Degeneration (ڈی جنریشن) میں اس کی جو تحقیق کی ہے وہ صحیح نہیں ہے اگرچہ دلایل سے اس کو مضبوط کیا ہے۔

دوسرا مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ اشعار میں وزن و قافیہ کا التزام کہاں تک ضروری ہے۔ ہندی ماہرین بلاغت نے اس کو دوسرے

درجہ میں رکھا ہے - چنانچہ سنسکرت کے اشعار میں قافیہ کا التزام نہیں لیکن مغربی مصنفین کے نزدیک وزن و قافیہ شعر کے لئے ضروری ہیں، پروفیسر بین اور جے - اس مل (J. S. Mill) بھی قریب قریب اسی خیال سے متفق ہیں، - چنانچہ ہند کے فضلا نثر کے کلام بلیغ کو بھی (جیسے کادمبری و سودت وغیرہ) اور ڈراما کو اقسام نظم میں شامل کرتے ہیں - والٹ وھٹین (Walt Whitman) بھی اسکو عملاً تسلیم کرتے ہیں - عملاً تو ظاہر ہے کہ وزن و قافیہ کے اضافہ سے شعر کی لذت میں چار چاند لگ جاتے ہیں لیکن نثر مسجع کی ترقی میں اس نے بڑی رکاوٹ پیدا کی - اسی طرح جو اشعار گائے جاتے ہیں ان کو معمولی اشعار پر فوقیت ہے اس لئے کہ ان سے کانوں کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے - اسی بنیاد پر ڈراما کو بھی بلاغت میں شامل کیا ہے جس طرح گانے سے کانوں کو سرور ہوتا ہے ڈراما سے آنکھیں لذت اندوز ہوتی ہیں اور اس سے بھی تحریک جذبات ہوتی ہے جو اصل شاعری ہے - لہذا سنسکرت کے مصنفین نے ان تمام اقسام کو شاعری میں داخل کیا ہے سنسکرت کے مصنفین کا قول ہے :- (काव्येषु नाटकं श्रेष्टम) (کاوی (نظموں) میں ناٹک مرجح ہی) اس سے ظاہر ہوا کہ بلاغت میں اصول شعر سے بحث ہوتی ہے - شعر میں الفاظ اور اسلوب بیان سے بحث کی جاتی ہے اور علم عروض میں صرف وزن و قافیہ سے بحث ہوتی ہے اسی طرح شاعری کے اقسام میں ناٹک (فن رقص) کو بھی شامل کیا ہے اس لئے کہ ناٹک میں ان حرکات اعضا و اشارات سے بحث ہوتی ہے جو محرک جذبات ہوں - انگریزی میں اس فن پر کتابیں بہت کم ہیں چنانچہ ہیرٹن کی کتاب The Actor's Art مشہور ہے - بھارت کی مشہور کتاب قدیم ناٹیہ شاستر کا انگریزی ترجمہ ہو رہا تھا - اسی طرح موسیقی کو بھی بلاغت کا ایک جزو ہندوؤں نے تسلیم کیا ہے جیسا کہ ان کا مشہور مقولہ ہے संगीतम् पि साहित्यम (سنگیتم پی ساہیتم) فن غنا بھی بلاغت ہے -

شعر کی تعریف : شودھونی ان محققین میں ہے جو اس نظریہ کے موید ہیں کہ شعر کی اصل تحریک جذبہ ہے - فاضل کوی ممت جو کشمیر کا رہنے والا برہمن بارھویں صدی مسیحی میں تھا اپنی کتاب کاوی پرکاش میں لکھتا ہے کہ "شعر وہ کلام ہے جو شامل ہو لفظ اور معنی پر جس میں کوئی غلطی نہ ہو، جو مخصوص اسلوب رکھتا ہو اور اگر کبھی اس میں استعارات و کنایات نہ ہوں تو کوئی حرج نہیں - یہ قید اس لئے لگائی ہے کہ اشعار میں تشبیہات وغیرہ کا ہونا ضروری ہے لیکن کوئی نظم ایسی ہو جس میں صنایع لفظی و معنوی نہ ہوں تو وہ شعر ہونے کے لئے مانع نہ ہوگا یہ تعریف جامع و مانع نہیں ہے بخلاف اس کے علم عروض عربی میں جو کتابیں ہیں ان میں شعر کی تعریف یہ ہے " کلام موزون مقفی"

ممٹ بھٹ کاویہ پرکاش میں لکھتے ہیں :-

नियतिकृत नियमरहिताम हादैकमयीमनन्यपरतन्त्राम
नवरस रुचिरां निर्मितिमादधती भारती कवेर्जयति ।

ترجمہ - اس شاعر کا کلام قابل عزت ہے جو ایسی چیز پیدا کرے جو قدرت کے بنائے ہوئے قانون سے آزاد ہو، حقیقی مسرت کو شامل ہو، مستقل ہو اور جو نو رسوں کی خوبیوں کو شامل ہو -

یہاں ~~नियति~~ سے مراد ہے اشیاء کے وہ خواص اور صفات ذاتیہ جن سے دوسرے خواص و صفات منتزع ہوتے ہیں

مثلاً کنول، اس سے اس کے معنی مصدری کنول ہونا اور اس کنول ہونے کے لئے جن صفات کی ضرورت ہے مثلاً خوشبودار ہونا۔ پانی میں ہونا، خوش آیند ہونا وغیرہ وغیرہ جن سے وہ اپنی حدذات میں دوسرے پھولوں سے ممتاز ہوتا ہے اس میں موجود ہوتے ہیں یا اس سے یہ مراد ہے کہ قدرت یا کسی دیوتا کی قوت بالغہ نے دُنیا میں ایک قانون بنا دیا ہے جس پر نظام عالم قایم ہے۔ یہ قانون ہر شے پر یکساں عمل کرتا ہے شاعر کا قانون اس سے بالکل جُدا ہوتا ہے۔

یہ قانون جو دُنیا میں رائج ہے شاعر کی دُنیا اس قانون میں بالکل الگ ہوتی ہے جہاں ایک عورت کے چہرہ کو نیلوفر کہتے ہیں اور اس میں خوشبو اور نزاکت تسلیم کی گئی ہے وہ خود شاعر کی دُنیا میں نیلوفر کی شکل میں بغیر پانی کے موجود ہے، جو فطرت اور قانون قدرت کے بالکل خلاف ہے۔

دوسرا امر جو شعر کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ مضمون کسی سے ماخوذ نہ ہو بلکہ شاعر خود اس کو پیدا کرے۔ تیسرے رس کی نو قسموں میں سے کوئی قسم اس میں موجود ہو۔

اغراض شاعری - کاویہ پرکاش کارکا ۲

काव्यं यशसेऽर्थकृते व्यवहार विदे शिवेतरक्षतये ॥
सद्यः परनिर्वृतये कान्ता सम्मित तयोप देशयुजे ॥ २॥

ترجمہ:- شعر کا مدعا شہرت، دولت، صحیح بات کا جاننا اور استعمال ہے یا مسلسل انتہائی مسرت، کوئی ایسی نصیحت جیسی بی بی اپنے شوہر کو کرتی ہے۔

مہا مہوپادھیائے شری گووند اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ شاعر وہ ہے جو اعلیٰ اور نادر خیالات کے اظہار پر قدرت رکھتا ہو۔ شاعری شہرت پیدا کرتی ہے جیسے کالیداس وغیرہ شعرا نے اسی شاعری سے بہت بڑی شہرت اور ناموری حاصل کی یہی ذریعہ حصول دولت بھی ہے جیسے دھاوک کو شری ہرش وغیرہ راجاؤں سے دولت ملی ہے اسی سے برائیوں کا ازالہ ہوتا ہے جیسا کہ میُور کو سورج دیوتا کی مدح سرائی سے حاصل ہوا (ایک واقعہ ہندوؤں میں مشہور ہے کہ میُور شاعر کو برص ہوگیا تھا اس نے ایک سو اشعار کا ایک قصیدہ سورج دیوتا کی تعریف میں لکھا تھا جس کی برکت سے اس کا مرض برص جاتا رہا) اسی طرح علامہ بوصیری کو جذام ہوگیا تھا، انھوں نے حضور سرور کائنات صلعم تشریف لائے اور اپنی ردائے مُبارک ان کو اُڑھادی۔ صبح کو جب وہ بیدار ہوئے تو بالکل تندرست تھے۔

اشعار کے مطالعہ سے ذوق صحیح رکھنے والوں کو فوری لذت اور مسرت تازہ حاصل ہوتی ہے اور یہ لذت و کیفیت باعتبار خوبی کلام اور حُسن ادا کے اس درجہ خیال پر قبضہ کرلیتی ہے کہ پھر انسان کی قوت ممیزہ بیکار ہوجاتی ہے۔ کمال شاعری یہی ہے اور شاعری کا منشا بھی یہی ہے، اشعار سے مناسب فرایض بادشاہ و وزیر و رعایا کے بتلائے جاتے ہیں۔ اسی شاعری کے ذریعہ سے نصائح اور مواعظ تاثیر پیدا کرتے ہیں۔

نورس - سنسکرت کے ماہرین علم النفس کا خیال ہے کہ انسان کے دل میں قدرت نے نو مستقل جذبات ودیعت کی ہیں۔ محبت،

شگفتہ[۲] دلی۔ افسوس[۳]۔ غصہ[۴]۔ حوصلہ یا امنگ[۵]۔ خوف[۶]۔ کراہت[۷]۔ تعجب[۸]۔ سکون[۹]۔

شاعری اور ناٹک میں یہی جذبات اپنے اسباب و آثار کی وساطت سے جب ارتقائی مدارج سے گزر کر دائرۂ وجدان میں پہونچتے ہیں تو ایک غیر محدود و انبساط اور لذت کا مرکز بن جاتے ہیں جس کو رس (रस) کہتے ہیں۔

ماہرین فن نے ان اسباب و آثار کی تقسیم و تعیین بھی کی ہے جن کی مدد سے جذبات مذکورہ ارتقائی مدارج سے گزرتے ہیں۔ چنانچہ ممٹ بھٹ نے اپنی کتاب کاوے پرکاش (काव्य प्रकाश) میں لکھا ہے کہ "وہ چیزیں جو عام طور پر علت، معلول اور محرکات جذبہ محبت وغیرہ سمجھی جاتی ہیں جب وہ شاعری اور ناٹک میں ہوتی ہیں، تو ان کو علی الترتیب ہیجج۔ اثر اور معدات کہتے ہیں اور جذبہ مستقلہ جو اشعار اور ناٹک میں ان کے ذریعہ سے ظاہر کیا جاتا ہے، اس کو رس کہتے ہیں"۔

اس تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ عملی زندگی میں تو یہ چیزیں جذبات کو واقعی طور پر پیدا کرتی ہیں اور اسلئے علت۔ معلول اور معاون کہی جاتی ہیں، مگر ناٹک اور شاعری میں ان کا صرف اتنا کام ہوتا ہے کہ فطرت انسانی کے پوشیدہ جذبات میں ایسی جنبش وجدانی پیدا کردیں کہ ناظرین ان سے مسرور ہوکر محو تماشا ہو جائیں۔ اس وجہ سے علت و معلول کو چھوڑ کر ان کو ناٹک و شاعری میں اصطلاحاً محرک۔ اثر اور منقلب کہتے ہیں۔

محرک ان اسباب کو کہتے ہیں جو کسی جذبہ کو حرکت دیتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں اساسی[۱]۔ ہیجج[۲]۔ محرک اساسی (Basic Cause) وہ چیز ہے جو کسی جذبہ میں جنبش وجدانی پیدا کرے اور ہیجج (Inflaming Cause) وہ اسباب ہیں جو اس جذباتی کیفیت کی تائید و تضعیف کریں اور اس کے واسطے مناسب خاطر خواہ ماحول بن جائیں۔

پھر اس ہیجانی کیفیت سے جو جسم میں بے اختیاری۔ قلب میں اضطراب اور نگاہ شوق میں حیرانی وغیرہ پیدا ہو جاتی ہے اسکو اثرات جذبہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب یہ اثرات سمندر کی لہروں کے مانند پے در پے مختلف اشکال میں ظہور پذیر ہونے لگتے ہیں تو انھیں منقلبات یعنی جذبات عارضی کہتے ہیں۔

مثلاً گھٹا چھائی ہے۔ بہار کا جوش ہے ذرہ ذرہ سے بہار کی رنگنیاں ٹپکی پڑتی ہیں اور ایک ماہر فن مغنیہ بزم سرود میں بجلیاں گرا رہی ہے۔ اس وقت مغنیہ کا حسن و کمال کسی اہل دل محو نظارہ کے قلب میں جذبۂ محبت پیدا کر دیتا ہے اور سامان بہار کی تائید سے باقتضائے فطرت انسانی یہ جذبہ محبت بھڑک اُٹھتا ہے تو پھر وہ (محو نظارہ) جذبۂ الفت سے بیخود ہوکر ان حالات میں مبتلا ہو جاتا ہے جن سے اس کے واردات قلبیہ کا اظہار ہوتا ہے مثلاً بے اختیاری میں ایسے الفاظ اس کی زبان سے نکلتے ہیں جن سے اثرات جذبۂ اُلفت مترشح ہوتے ہیں۔ اس کے بعد تیسرے درجہ میں پہونچکر اس کیفیت میں اور تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور اس پر پے در پے مایوسی۔ امید۔ جنون شکستہ دلی وغیرہ کا عالم طاری ہوتا رہتا ہے۔

مثال بالا میں محبت جذبۂ مستقل ہے اس کا محرک اساسی مغنیہ حسینہ اور ہیجج، سامان بہار۔ اور اشکباری اور سراسیمگی (واردات قلبیہ کو ظاہر کرنے والی کیفیات) اثرات جذبہ ہیں۔ مایوسی۔ امید۔ جنون وغیرہ منقلبات (Variants) یعنی عوارض ہیں

ناٹک اور شاعری میں انھیں تینوں کا سین کھینچنے سے بالآخر جذبۂ مستقل میں ایک غیر محدود لذت۔ وجدانی لطافت اور پاکیزہ روشنی پیدا ہوتی ہے، اس وقت وہی جذبہ مستقل رس کہا جاتا ہے۔ اس طرح مذکورہ بالا جذبات مستقلہ مدارج ارتقائی سے گزر کر علی الترتیب عشق۔ ہنسی۔ رحم۔ غضب۔ بہادری۔ دہشت۔ نفرت۔ حیرت اور سکون کا رس کہلاتے ہیں۔

شرنگار، رس शृंगार | اس میں خواہش نفسانی کا اظہار ہوتا ہے اس کا جذبۂ مستقل رتی (خواہش نفسانی) اس کا آلمبن (आलम्बन) (وہ ذات جس سے اس کا تعلق ہے) نئی عورت اور مرد جوان اس کا اودی پن (उद्दीपन) (رس کیفیت اور جذبہ کا معاون) کوئل۔ پپیہا کی آواز۔ چاند۔ صندل وغیرہ ہیں اور انوبھاؤ (अनुभाव) (اس جذبہ کے اظہار کے ذرایع) ترچھی نگاہ۔ ابرو کا اشارہ وغیرہ۔ اس کا وی بھی چاری بھاو (ان کیفیات کو کہتے ہیں جو کسی رس کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ آثار مختلفہ ہیں جو مختلف صورتوں میں قلب پر وارد ہوتے ہیں) سستی۔ کاہلی اور نفرت ہے۔ اس کا رنگ ورا اس کیفیت کا دیوتا (ہنود ہر چیز کی ہستی کو قایم رکھنے کے لئے ایک دیوتا مانتے ہیں جس کو اشراقیین رب الاصنام اور مشائین رب النوع کہتے ہیں اس کی مفصل بحث حکمۃ الاشراق وغیرہ کتب فلسفہ میں موجود، یہاں اس کے ذکر کا موقع نہیں) وشنو دیوتا ہے۔

ہاسی۔ (ہنسی) हास्य | سفید رنگ جذبہ مستقل (स्थायी भाव) ہنسی۔ جس آواز۔ کلام یا حرکت کو دیکھکر انسان کو ہنسی آوے وہ آلمبن اس کی حرکتیں اودی پن۔ خواہش نفسانی وغیرہ انوبھاؤ کسل، نیند وغیرہ ہیں، پہلا دوی بھی چاری دیوتا ہے۔

کرونڑا (رحم) करुणा | سفید رنگ جذبہ مستقل स्थायी भाव (استھائی بھاؤ) سوچ آلمبن جلن وغیرہ رودی پن زمین پر لوٹنا۔ گریہ وزاری انوبھاؤ شکستہ دلی۔ پریشانی۔ صرع۔ تکان۔ تذکر۔ محنت۔ بے حوصلگی۔ سراسیمگی۔ جنون اور فکر۔ وی بھی چاری یم دیوتا۔

رودر (غضب) रौद्र | غصہ جذبہ مستقل (استھائی بھاؤ) دشمن آلمبن دشمن کی حرکات اودی پن چیں بجبیں ہونا۔ ہونٹ چبانا۔ خم ٹھوکنا۔ جھڑکی دینا۔ اپنے پچھلے بہادری کے اوصاف بیان کرنا۔ ہتھیار گھمانا۔ غضب۔ گھبراہٹ۔ اقشعرار۔ عرق ریزی۔ لرزہ اور مستی انوبھاؤ اعتراض کرنا۔ غضب آلود نگاہیں ڈالنا۔ پریشانی اور ضد انتقام۔ وی بھی چاری (بھنبھوڑنے۔ پھاڑ ڈالنے۔ گھونسا مارنے۔ گرا دینے اور جنگ کے لئے بیتابی کے بیان سے یہ رس خوب چمکتا ہے۔ بہادری میں یہ علامت پیدا نہیں ہوتی کیونکہ بہادری کے رس میں حوصلہ جذبہ مستقل ہوتا ہے) راودر دیوتا۔

ویر بہادری वीर | یہ رس عالی ظرف ہیرو میں پیدا ہوتا ہے اس کا جذبہ مستقل حوصلہ ہے فتح کرنے کے قابل مرد مقابل آلمبن ہے۔ مرد مذکور کی حرکات اودی پن ہیں۔ معاونین جنگ (ہتھیار۔ فوج وغیرہ) کی تلاش انوبھاؤ ہے۔ سکون۔ فیصلہ۔ گھمنڈ۔ تذکر۔ سوچ بچار اور اقشعرار وی بھی چاری رنگ سونا مہیندر دیوتا۔

بھیانک (دہشت) भयानक | خوف اس رس کا جذبہ مستقل (استھائی بھاؤ) ہے اسکا محل عورت اور ادنیٰ درجے کے لوگ ہیں جس سے خوف پیدا ہو جیسے شیر وغیرہ آلمبن اور اس کے حرکات اودی پن رنگ فق ہو جانا۔ آواز کا بھرانا۔ بے ہوشی۔ پسینہ پسینہ ہو جانا۔ اقشعرار (رونگٹے کھڑے ہونا) لرزہ۔ ادھر ادھر تکنا انوبھاو کراہت۔ گھبراہٹ۔ پریشانی۔ دل دہلنا۔ تکان۔ بے بسی۔ کھٹکا۔ صرع

اور موت وی بھی چاری - سیاہ رنگ - کال دیوتا -

وی بھتس वीभत्स **نفرت** | اس رس کا جذبہ مستقل کراہت ہے بدبودار گوشت - خون اور چربی اس کا آلمبن اور ان میں کیڑے کلبلانا اور بدبو آنے لگنا وغیرہ اور وی پن تھوکنا منہ پھیر لینا اور آنکھیں میچ لینا انوبھاؤ پریشانی - صرع - گھبراہٹ - مرض اور موت وی بھی چاری رنگ نیلا - مہا کال دیوتا اس کی مثال (سنسکرت کی ایک نظم کا ترجمہ جو اس رس میں لکھی گئی) "یہ فاقہ کش بھوت اپنی گود میں رکھے ہوئے اس مردہ کے جسم کی کھال ادھیڑ ادھیڑ کر پہلے تو کندھے - سریں - پیٹھ - پنڈلی وغیرہ اعضا کے موٹے موٹے سوجے ہوئے اور سہل الوصول بدبودار گوشت کو کھا چکا - پھر بھی گرسنگی سے تنگ آکر آنکھیں پھاڑے (گوشت ڈھونڈھنے کے لئے) دانت نکالے (ہڈیوں میں سے گوشت نوچنے کے لئے) اب ہڈیوں میں چپکے اور جوڑوں میں پیوست گوشت کو بھی بغیر کسی گھبراہٹ کے بڑے شوق سے چبا رہا ہے"۔

اس مثال میں کراہت جذبہ مستقل اور اس کا محرک اساسی (آلمبن) مردہ کی لاش ہے، لاش کی چیر پھاڑ اور اس کا گوشت کھانا محرک ہیجان (رو وی پن) اس سین کو یا ایسے اشعار کو دیکھنے والوں کا ناک اور منہ سکیڑنا اور منہ پھیر لینا نیز تھوکنا اس کے اثرات (انوبھاو) اور پریشانی منقلبات (وی بھی چاری)

ادبھت (حیرت) अद्भुत | اس رس کا جذبہ مستقل تعجب ہے - عالم آب و گل سے بالاتر (دُنیا سے نرالی) چیز آلمبن اور اُس کے اوصاف کا بیان اود دی پن اور سکتہ - عرق ریزی - اقشعرار آواز بھرانا اور کشادگی چشم انوبھاو سوچ بچار - گھبراہٹ - تغیر عقل اور خوشی وی بھی چاری -

شانت (سکون) शान्त | اس رس کا جذبہ مستقل تسکین ہے محل عالی ظرف ہستی - دُنیا کی بے ثباتی اور بے وقعتی کا اظہار یا خدا کی ذات آلمبن - اللہ والوں کی پاک قیام گاہیں متبرک مقامات خوشنما گوشہ تنہائی اور خدا رسیدہ لوگوں کی صحبت اود دی پن - رونگٹے کھڑے ہونا انوبھاو خوشی - شکستہ دلی - تذکر - فیصلہ اور ترحم وی بھی چاری رنگ چاند کی طرح شری نارائن دیوتا - بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ڈراما میں سکون کا سین کھینچا نہیں جا سکتا کیونکہ اس میں تمام خواہشات کے فنا ہو جانے کی وجہ سے اقشعرار وغیرہ تاثرات پیدا ہی نہیں ہوتے پھر کس چیز کا سین کھینچا جائے گا، نیز گانا بجانا بھی اس کے منافی ہے لہذا یہ رس صرف شاعری میں ہوتا ہے ڈراما میں نہیں مگر دوسرے لوگ اس رائے کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کا بھی سین کھینچا جا سکتا ہے اور اس سے متعلق موسیقی (معرفت کے مضامین) وغیرہ بھی اس کے مخالف نہیں ہیں چنانچہ سنگیت رتناکر संगीत रत्नाकर نامی فن موسیقی کی کتاب کے آخری باب میں یہ خیال موجود ہے کہ "بعض لوگ کہتے ہیں کہ ڈراما میں آٹھ ہی رس ہیں یہ درست نہیں ہے کیونکہ کون سا ایکٹر ہے جو اس کا لطف نہیں اُٹھاتا"۔ یہ مقدمہ صرف اس لئے لکھا گیا کہ اشعار کی انتقاد کے لئے بہت مفید چیز اور ہندی (برج بھاشا) کے اشعار انھیں اصول پر قایم ہیں - عربی اشعار سے مماثلت اور ترادف میں یہ امر ظاہر ہوگا کہ وہ جذبات جو فطری ہیں دونوں میں مشترک ہوں گے لیکن بلحاظ تمدن اور معاشرت اور ملکی حالت کے مہیجات اور عوارض میں فرق ضروری ہے -

بہاری لال :- کہت بے کاج چلائیت چتو رائی کی چال کہے دیت گن راورے سب گن نرگن مال

ترجمہ :- بے کار چالاکی کیوں کرتے ہو یہ بغیر ڈوری کا مالا آپ کی تمام حرکتوں کو ظاہر کر رہی ہے۔

اسی مفہوم کا شعر عربی کا ملاحظہ ہو :-

أتيت بخارقٍ عجبٍ صباحًا لبست قلادةً لاخيط فيها

(صبح آپ نے عجیب بات پیش کی، آپ نے بغیر دھاگے کا ہار پہن رکھا تھا)

بہاری لال :- شوبھا بھار سنبھار ہیں کیوں یہ تن سکمار سو دھو پانوں دھر پرت، ہی شوبھا کو بھار

(یہ نازک جسم زیور کے بوجھ کو کیونکر اُٹھا سکیگا جبکہ حُسن کے بوجھ سے زمین پر پاؤں نہیں رکھ سکتی)

ابوالعلا معری :- ویا اسیرة حجلیہا اری سفہًا حمل الحلیّ لمن اعیا عن النظر

تیرے دونوں پاؤں کڑے کی قید میں ہیں تعجب ہے جو تار نظر کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی وہ زیور کا بوجھ کیونکر اُٹھا سکتی ہے)

سورداس :- جاؤ جاؤ اَجر جاؤ ہے کاگ

جیون تورے چرن شگن پیا آئی ہیں جاگی ہماری بھاگ

میٹھ دودھی کا دونا دہی ہوں او انچرے کی پاگ

(جاے کوّے جا اگر تیرے قدم کی برکت سے میرا پیا آجائے گا تو مٹھی دہی کا تحفہ تجھ کو دوں گی اور اپنا آنچل پھاڑ کر تیری پگڑی بناؤں گی)

ابوالعلا معری :- اذا صاح ابن دایتہ بالتدانی جعلنا خطر لمتہ جسادا

(اگر کوّا بولے اور یار کے ملنے کی بشارت دے تو اس کے پروں کو زعفران رنگ دوں)

نضمخ بالعبیر لہ جناحًا احمّ کانہ طلی المدادا

(اس کے پر میں عبیر مل دوں جو ایسے سیاہ ہیں گویا روشنائی لگا دی گئی ہے)

بہاری لال :- نِش اندھیاری نیل پٹ، پہر چلی پیا گیہ کہو دُو راہی کیوں ڈرے، دیپ شکھا سی دیہ

(اندھیری رات ہے نیلا کپڑا پہن کر پیارے کے پاس جا رہی ہے مگر یہ چراغ کی طرح روشن جسم کیسے چھپے گا)

ابوالعلا معری :- توقک سترو زارت جہارا وھل تطلع الشمس الا نہارا

(معشوقہ نے تجھ سے چھپ کر ملنے سے گریز کیا وہ علانیہ ملی کیونکہ سورج دن ہی کو نکلتا ہے مطلب یہ ہے کہ اس نے رات کو چھپ کر ملنے سے اس وجہ سے احتراز کیا کہ وہ خود سورج ہے اور سورج دن ہی کو نکلتا ہے اس لئے اس کا رات کو نکلنا بیکار)

بہاری لال :- اری کھری سٹ پٹ پری، بدھو آدھے مگ میری سنگ لگے، دھپ لئی، بھاگن گلی اندھیری

(اے سکھی! آدھے راستہ میں چاند کو دیکھ کر مجھ کو پریشانی ہوئی کہ بھونروں نے (اس کو پھول سمجھ کر) گھیر لیا لیکن خوش قسمتی سے اسکو اندھیری گلی مل گئی اس میں جاکر بھونروں کے محاصرہ سے چھوٹی)

ابوالعلا معری :۔ کان الغمام لہا عاشقٌ یسائرھود جہا این سارا

(گویا کہ ابر اس کا عاشق ہے اس کے ہودج کے ساتھ ساتھ چلتا ہے جہاں ہودج جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عرب عادتاً بارش اور مواقع بارش کے تلاش میں سفر کرتے ہیں یہاں معشوقہ کی وجہ سے مضمون برعکس ہوگیا کہ ابر خود اس کا عاشق ہے اس کی جستجو میں سفر کرتا ہے۔

بہاری لال :۔ پاوک سوں نینیں لگیو، جاوک لاگیو بھال ٹکر ہوہو ہو گے نہ کم، ٹکرو بو کو لال

(آنکھوں میں آگ سی لگی ہے، ماتھے میں جو مہاور (لاکھ کا رنگ) لگا ہے، تھوڑی دیر میں ٹکر (منکر ہو) جاؤ گے اس لئے اے لال! ذرا آئینہ میں اپنا منہ تو دیکھو مطلب یہ ہے کہ آنکھیں رات کو جاگنے سے سرخ ہیں اور معشوق کے پاس سونے سے ماتھے میں شنجرف کا رنگ لگا ہے اس کو عاشق سے چھپانا چاہتا ہے، عاشق اس کو سمجھ جاتا ہے اور اس کو شرمندہ کرنے کے لئے کہتا ہے آئینہ دیکھو شاید تم انکار کرو)

ابوالفرج البیغا :۔ لقد سقتہ فتاۃٌ خمر ریقتہا کلاہما فی رغید العیش قد باتا

وجاء صباحًا الی مثوی حلیلتہ فسلمت لید المخمور مرآتا،

(معشوقہ نے اسے اپنے لعاب دہن کی شراب پلائی دونوں نے صبح تک عیش و عشرت میں بسر کی صبح کو وہ اپنی زوجہ کے پاس آیا تو زوجہ نے اس مخمور کے ہاتھ میں آئینہ دیدیا

بہاری لال :۔ جیون جیون پرسے لال تن، تیوں تیوں رکھے گوئے نوَل بدھو ڈر لاج تے، اندر بدھو سی ہوئے

(جیوں جیوں عاشق اس کے بدن کو چھوتا ہے تیوں تیوں وہ سمٹتی جاتی ہے۔ نئی عورت خوف و شرم سے بیر بہوٹی کی طرح ہو رہی ہے)

الامیر مجیر الدین :۔ وتنقبت بخفیف غیم ابیض، ہی فیہ بین تخفز و تبرج

کتفضُّ الحسناء فی المرآۃ اذ کملت محاسنہا ولم تتزوج

(تھوڑے سپید ابر کو دیکھ کر نقاب ڈال لیا کبھی شرما کر چھپتی ہے اور کبھی باہر آتی ہے جیسے ایک حسین عورت جس کا حسن مکمل ہو چکا ہو اور ابھی اس کی شادی نہ ہوئی ہو اپنے ہاتھ میں آئینہ لے۔

بہاری لال :۔ ملن کری چھبی جونہ کی، تنو چھبی سوں چلی جاؤں کو جانی ہے پیا پے سکھی لکھی جائی ہیں سب گاؤں

(شب ماہ کی چاندنی کو اپنے جسم کی روشنی سے دھلی کر کے کیوں کر یار کے پاس جا سکتی ہوں اس لئے کہ سب گاؤں کے لوگ سمجھ جائینگے)

متنبی :۔ امن ازدیارک فی الدجیٰ الرقباءُ اذ حیث کنتِ من الظلام ضیاء

قلق المليحۃ وہی مسک شمکھا وسیرُھا فی اللیل وہی ذکاءُ

(مطلب یہ کہ دن ہو یا رات تجھ سے کوئی نہیں مل سکتا کیونکہ دن میں تیری جسم کی مشک سی خوشبو اور رات کا تیرے حسن سے دن ہو جانا دونوں پردہ دریں)

لا اعلم :۔ پیارے میرے نیند کی، بات تہارے ہاتھ آوت ہی تم ساتھ ہی، گئی تمہارے ساتھ

(اے محبوب میری نیند تمہارے ہاتھ ہے تمہارے ساتھ ہی آتی ہے اور تمہارے ساتھ چلی گئی)

متی غبتم فغاب النوم عنی تدانیتم مخبئۃ بائر و

(جب تم چلے گئے تو نیند چلی گئی اور جب تم آئے تو مسرت آئی)

لا اعلم :- آؤ پیارے نین میں، نین موند میں لوں ناہیں دیکھوں اور کو، ناہیں تو ہیں دیکھے دوں (معنی واضح ہیں)

فلو انی استطعت خفضت طرفی فلم ابصر بہ حتی اراکا

(اگر میں قدرت رکھتا تو آنکھیں بند کر لیتا تاکہ تمہارے بعد کسی اور کو نہ دیکھ سکتا)

بہاری لال :- دیوا رگ نیچے چلو، سنکٹ بھانے جائے سُو جیتی ہوے اور رے بَے، ششی ہی دلو کے آئے

(اب پوجا وے چکی نیچے چلو (کھانا کھا کر) تکلیف دور کریں اور بھی سب مطمئن ہو کر چاند کو آکر دیکھیں یعنی دو چاندوں کا شبہ جاتا ہے)

متنبی :- واستقبلت قمر السماء بوجھہا فارتنی القمرین فی وقت معا

(جب معشوقہ نے اپنا چہرہ چاند کے سامنے کر دیا تو مجھ کو ایک ہی وقت میں دو چاند دکھائے)

بہاری لال :- ان دکھیا آنکھیں کو، سکھ سرجو نا ہیں دیکھت بنے نہ دیکھتے بن دیکھے اُکلا ہیں

(اے سکھی! ان دکھیا آنکھوں کی قسمت میں سکھ نہیں ہے دیکھنے پر دیکھا نہیں جاتا اور بغیر دیکھے بے چین یعنی ملاقات کے وقت بیتابی شوق سے روتی ہیں جس سے دیکھا نہیں جاتا اور جدائی میں درد فراق سے روتی ہیں)

متنبی :- وبین الرد والسخط والقرب والنوی مجال لدمع المقلۃ المتفرق

(رضا اور غصہ میں وصل میں اور جدائی میں دونوں حالتوں میں آنکھیں آنسو بہاتی ہیں)

بہاری لال :- میں لکھی نار سی گیان، کر را کھو نر دھا رمیہ وہ ہی روگ نداں، وہی بید یہ اوشدو ہی (سورٹھا)

(میں نے اس عورت کی حالت دیکھ کر عقل سے جانا کہ وہی اسکی بیماری کا سبب ہے وہی معالج ہے وہی دوا ہے)

ابن کشاجم :- یارامیًا من لحظ طرفک اسہما تقبیل وردۃ وجنیک شفائی

عجبا لطرفک کیف دائی کامنٌ فیہ وثغرک کیف فیہ دوائی

(اے اپنی نگاہوں کا تیر چلانے والے تیرے گلاب سے رخساروں کے بوسہ میں میری شفا ہے - تیری نظر عجیب ہے کہ اس میں میری بیماری پوشیدہ ہے اور تیرے دہن میں میری شفا ہے)

غیر معلوم :- آج دوج بدیس پیو، ششی نکسو اوہی اور ہم نینا اور پیو کے آئے بھئے یک ٹھور

(آج ہی پہلی تاریخ کا چاند ہے اور اسی طرف نکلا ہے (یار سفر میں ہے) میری آنکھ اور یار کی آج ایک ہی جگہ مل گئیں مطلب یہ ہے کہ پہلی تاریخ کو محبوب چاند دیکھے گا جیسا کہ دستور ہے اور میں بھی دیکھ رہی ہوں دونوں کی نگاہیں آج مل گئی ہیں)

ابن الرومی :- ولست احب الضوء الا بوجھہا ولا البدر الا طالعًا من بلادہا

(محبوب کے چہرہ کی روشنی کی وجہ سے مجھ کو روشنی پسند ہے۔ اور چاند کو اس وجہ سے محبوب رکھتا ہوں کہ محبوبہ کے دیار سے نکلا ہے)

بہاری لال :- مکھ گرمیم پاؤس نینن، جیا مہی یاں جر کال پیا بن تنوتے تین رت کب ہوں نہ مٹت جمال

(چہرہ سے گرمی (خشکی) آنکھوں سے بارش سینہ میں جاڑا (لرزہ) اے جمال! محبوب کی جدائی سے جسم میں تینوں فصلیں برابر قایم ہیں)

ابوالحسن محمد بن طباطبا:- سألتُ الفراق صبًّا وَما ـــ يُنبِئُهَا بالفراقِ مثل خبير

هُو بين الحشا صدوعٌ وفي الاعيُنِ ماءٌ وجمرةٌ في الصدورِ

(میں نے ایک عاشق سے فراق کا حال پوچھا کیونکہ واقف کار سے زیادہ فراق کا حال دوسرا نہیں بتا سکتا تو معلوم ہوا کہ فراق پہلو میں شگاف ہے آنکھ میں پانی اور سینوں میں آگ)

بہاری لال :-۱ سوہت اوڑھے پیت پٹ، شیام سلونے گات مانو نیل منی شیل پر آتپ پڑیو پر بھات

(سیاہ نمکین جسم پر زرد رنگ کا کپڑا (شری کرشن کا لباس) ایسا خوبصورت معلوم ہوتا ہے جیسے نیلم کے پہاڑ پر صبح کی (ہلکی) دھوپ پڑ رہی ہو)

احنف العکبری :- فزحزحت شفقًا غشّى سنا قمرٍ وساقطت لؤلؤًا من خاتمٍ عطرِ

(معشوقہ نے شفق کو ہٹایا جس نے چاند کی روشنی کو چھپا رکھا تھا اور معطر انگوٹھی سے موتی گرائے (شفق سے مراد چادر ہے) چہرہ سے چاند دانتوں سے موتی اور منہ سے انگوٹھی)

بہاری لال :- ادھر دھرت ہری کے پرت، ہونٹھ دیٹھ پٹ جوت ہرت بانس کی بانسری اندر دھنش رنگ ہوت

(شری کرشن) جب اپنے ہونٹھ پر سبز رنگ کی بانسری رکھتا ہے تو اس پر اس کے ہونٹھ کی سرخی اور آنکھ کی سپیدی اور سیاہی اور کپڑے کی زردی کا عکس پڑنے سے بانسری قوس قزح کا رنگ اختیار کرتی ہے)

بحتری :- حُمرةٌ خُلِطَ صفرةٌ في بياضٍ مثل ما حاك حائكٌ ديباجا

(معشوقہ کے چہرہ کی) سُرخی زردی کے ساتھ سپیدی میں اس طرح ملی ہے جیسے کسی جولاہے نے دیباج بنا ہو۔

غیر معلوم :- ادھر جوت بدرم بھیو، کہ کرمکتا لین نرکھت ہی گنجا بھیو، کہ ہنس کر مکتا دین

(معشوقہ نے ہاتھوں میں موتی لیا تو اس کے ہونٹھ کے عکس سے موتی لعل ہو گیا اس تغیر کو جب غور سے دیکھا تو اس کی آنکھوں کے عکس سے موتی گھنگچی ہو گیا جب موتی کے ان تغیرات پر اس کو ہنسی آئی تو دانتوں کے عکس سے پھر موتی ہو گیا تو اُسے واپس کیا۔

غیر معلوم :- لیلٌ وبدرٌ وغُصنٌ شعرٌ وَوَجهٌ وقدٌّ
خمرٌ وَدُرٌّ وَوَردٌ ريقٌ وثغرٌ وخدٌّ

(اس کی زلف رات ہے۔ چہرہ ماہتاب۔ قامت شاخ۔ لعاب دہن شراب۔ دانت موتی اور چہرہ گلاب)

غیر معلوم :- تم بن اے تی کو کرے، کرپا موپر ناتھ موہے اکیلی جان کے دکھ کر دینو ساتھ

(تمہارے سوا مجھ پر ایسی مہربانی کون کرے گا - مجھ کو تنہا سمجھ کر دکھ کو میرے ساتھ کر دیا -

القاضی التنوخی :- اُنبیک عن عینی وطول سُھادہا ووحدۃ نفسی بالاسٰی والنفرادہا

وانّ الھموم اعتدن بعدک مضجعی وانت الذی وکلتنی باعتیادہا

(میں تجھ کو اپنی آنکھ اور اس کی مسلسل بیداری اور اپنے غم کے ساتھ اپنی تنہائی کی خبر دیتا ہوں اور تیری جدائی سے غم میری خوابگاہ کو نہیں چھوڑتا اور تو ہی ہے جس نے غم کو میرے سپرد کر دیا -

بہاری لال :- لاگت کوئل کٹاکش شر کیوں نہ ہوئے بے حال نکست ہیو دو سال کر، تو رہت نہ ٹسّال

(یہ ترچھی نظر کا تیر لگنے سے عاشق کیوں نہ بدحال ہو - کلیجہ سے پار ہو جاتا ہے لیکن اس کی کھٹک نہیں جاتی)

علی بن الرومی :- ورمیٰ ومارمتا یداہ فصابنی سھمٌ یعذبُ والسّھامُ تُریحُ

(اسکے ہاتھوں نے تیر نہیں چلایا بلکہ اسکی نظر نے چلایا اور وہ تیر میرے اس طرح لگا کہ ہر وقت مجھ کو دکھ دے رہا ہے درانحالیکہ دوسرے تیر تو جان لیکر چھٹکارا کر دیتے ہیں)

غیر معلوم :- اوشدہ نین سے لکھے، برہ روگ نہیں جات پاتی بھیجے کا بھئے، جب لگ ملو نہ آئے

(دوا کو محض آنکھ سے دیکھ کر درد جدائی نہیں جاتا خط بھیجنے سے کیا ہوتا ہے جب تک خود ہی نہ آؤ - (بہتر شعر ہے)

ابن ابی عیینہ المہلبی :- کُن جَوابی اذا قرأت کتابی لا تقُل للرّسُولِ کانَ وکُنّا

(جب میرا خط پڑھے تو خود جواب ہو جا - قاصد سے اِدھر اُدھر کی نہ کہ)

مولوی محمد معصوم مرحوم چریاکوٹی ابن علامہ عنایت رسول عباسی چریاکوٹی کا یہ دوہا ملاحظہ ہو جس کا مثل اب تک مجھ کو نہ مل سکا)

رات سجن گھر پاہُونا، بھورے بَدے گمَن ہٹے پہے جھگڑا لگے کہ پہلے پھاٹے کوَن

(محبوب رات ہمارے گھر مہمان ہوا اور صبح ہی واپس جانے کی ٹھان لی - کلیجے میں اور پو (صبح کی روشنی) میں یہ جھگڑا ہوا کہ پہلے کون پھٹے -

بہاری لال :- چھلّا پرو سن ہاتھ تے، چھل کر لیو پچھانی پیا ہی دکھایو لکھی ملکھی، رس سُوچک مُسکانی

(پیاری کی انگوٹھی پہچان کر ہمسایہ عورت کے ہاتھ سے اُسے فریب دیکر لے لیا اور ناخوش ہو کر پیارے کو دکھایا اور غصہ آمیز ہنسی سے مسکرا کر رنجیدہ ہوئی (مدعا یہاں اظہار غرور حُسن ہے)

متنبی :- شامیتہ طالما خلوتُ بہا تبصرنی ناظری مُحیّاھا

فقبلت ناظری تعالُطنی انما قبلت بہ خاھا

فلیتھا لا تزال آویۃً ولیتہ لا یزال ماواھا

(وہ محبوبہ شامیہ جس کے پاس تنہائی میں اکثر میں اس حالت میں رہا ہوں کہ وہ اپنے چہرہ کو میری آنکھ میں دیکھتی رہی - تو اس نے براہ مغالطہ میری آنکھ کو چوما اس کی غرض اس چومنے سے بجز اس کے نہ تھی کہ اپنے منہ کو جو میری آنکھ میں نظر آرہا تھا چومے - اے کاش وہ محبوبہ ہمیشہ میری آنکھ میں رہے اور کاش میری آنکھ اُس کا محل رہے (مدعا یہاں اظہار غرور حسن ہے)

بہاری لال :- پوس ماس سن سکھن پے، سائیں چلت سوار گہی کر بین پروین تیہ، روہیں راگ ملار

پوس کے مہینہ میں سکھیوں سے یہ بات سن کر کہ صبح کو یار سفر کرے گا ہاتھ میں بین لے کر ملار کی راگ گانا شروع کی (مدعا یہ ہے کہ ملار کی راگ گانے سے پانی برسیگا اور جب پوس کے مہینہ میں پانی برسے تو ہندؤں کے عقیدہ کے مطابق سفر منحوس ہوتا ہے باہر کا سفر رُک جائے گا)

ابن کشاجم :- عطس الرسول وقد اَتیٰ برسالتہٖ منکم الی فتم ذاک الموعدُ
وظفرت عند عطاسہ بزیارۃ عاشت بھا نفسی ومات الحُسّدُ

(جب قاصد تمہارا خط لایا اور چھینکا تو وعدہ پورا ہوگیا اس کے چھینکنے سے ملاقات نصیب ہوئی اور میرا نفس زندہ ہوگیا اور حاسدین مرگئے)

لامعلوم :- کاغذ بھیجت نین جل، کر کانپت مسی لیت، پاپی برہا من بسے، لکھن نہیں دیت ،

(ترجمہ واضح)

ابن الرومی :- وحسبی ما اَخَّرتُ کتبی عنکم یقول وشاۃ او کلام محرش
ولکن دمعی ان کتبت مشوش کتابی و ما نفع الکتاب المشوش

(کافی ہے مجھ کو کہ میں نے تم کو خطوط بھیجنے میں تاخیر کی تو اس کا خاص سبب تھا اور وہ یہ کہ میرے آنسو خط کو خراب کر دیتے ہیں اور بگڑے خط سے کوئی فایدہ نہیں)

لامعلوم :- پاتی وا کو بھیجئے جو ہو پر دیس ، جو نش دن من ہی بسے، وا کو کون سندیس (ترجمہ واضح)

محمود الوراق :- ومن عجب انی اسائل عنھم وہم بین احشاء الجوانح والصدر

(یہ عجیب بات ہے کہ میں ایسے شخص کا حال پوچھتا ہوں جو دل و جگر میں مقیم ہے)

لامعلوم :- رنگ راتی راتے ہئے، پریتم لکھی بنائے پاتی کاتی برہ کی، چھاتی رہی لگائے

(محبوب نے سُرخ رنگ کے کاغذ پر محبت بھرے ہوئے دل سے خط لکھا عاشق نے درد جدائی کو دور کرنے کے لئے خط کو سینہ سے لگا لیا)

لامعلوم :- پیارے میرے نیند کی بات تہارے ہاتھ آوت ہے تم ساتھ ہی گئی تمہارے ساتھ

(ترجمہ واضح)

لعمری لقد قرت بقربک اعین ، وقد سخنت بالبعد منک عیون

(قسم ہے میرے عمر کی تیری نزدیکی سے آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں اور تیری جدائی سے آنکھیں گرم ہوئیں)

بہاری لال :- مینا نیک نہ مان ہیں ، کتو کہیو سمجھائے تن من ہارے ہو ہنسیں، تن سو کاہ بسائے

(یہ آنکھیں میری ایک نہیں مانتی ہیں ان کو کتنا ہی سمجھا کر کہا یہ جسم و جان کو ہار کر بھی ہنستی ہیں)

الصولی :- فمن کان یوتی من عدو وصاحب فانی من عینی اتیت و من قلبی

هما اعتورانی نظرة تم فکره فما البقیالی من رقاد و من لب

(کسی کو دشمن اور دوست سے رنج پہونچتا ہے لیکن مجھ کو اپنی آنکھ اور قلب سے رنج ہے انھیں دونوں نے مجھے دیدار اور فکریں ڈال دیا اور میری عقل اور نیند کو چھین لیا)

بہاری لال :- مانو بدھی تن اچھ، سو اچھ راکھی بے کاج درگ پگ پوچھن کو بھوشن کٹی پا انداج

(گویا کہ خدا نے اس کے جسم کی خوبصورتی کو قایم رکھنے کے لئے زیور کو پا انداز (Foot mat) بنایا تاکہ پائے نگاہ زیوروں سے صاف ہو کر اس کے جسم تک پہونچے)

الصولی :- ما سافرت لحظات عینی نحوکم الا علی خیل من العبرات

(میرے آنکھ کی نگاہ نے تمھاری طرف سفر نہیں کیا مگر آنسوؤں کے مرکب پر)

لامعلوم :- سانجھ بھئی دن اکٹھوں لاگے، چکئی دینی روئے چل چکوا وا دیس کو کہ رین جہاں نا ہوئے

(چکوا یہ سرخاب کے جوڑے کی خاصیت ہے کہ شب کو دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ :- کنا کزوج حمامہ فی ایکتہ متمتعین بصحة و شباب

دخل الزمان بنا ففرق بیننا ، ان الزمان مفرق الاحباب

(ہم دونوں کبوتر کے جوڑے کی طرح ایک جھاڑی میں جوانی اور صحت سے متمتع ہو رہے تھے، زمانہ حسایل ہوا اور ہم

دونوں میں جدائی ڈالی۔ زمانہ دوستوں میں جدائی ڈالنے والا ہے (حضرت فاطمہؓ کی وفات میں کہا گیا ہے)

بہاری لال :۔ رہی ہیں چنچل پران یہ، کہی کون کی اگوٹ للن چلن کی چت دھری، کلن پلن کی اوٹ

(سکھی اب یہ میری مضطرب روح کس کے روکنے سے رُکے گی۔ پیارے نے چلنے کا خیال دل میں ٹھان لیا ہے اور مجھے اسکے آنکھوں سے اوجھل ہونے سے کل نہیں پڑتی۔

ابوالفرح البغا :۔ لاعذب اللہ نفسی بالبقاء فلا اظننی بعدکم بالعیش انتفع،

(اللہ (تعالیٰ) میری جان کو زندہ رکھ کر نہ ستائے۔ میں خیال نہیں کرتا کہ تمہارے بعد زندگی سے نفع اُٹھاؤں گا)

بہاری لال :۔ اجوں نہ آئے ہیج رنگ، برہ دوبرے گات اب ہیں کاہ چلائیت، للن چلن کی بات

(ابھی تک تو درد جدائی سے جسم لاغر میں اصلی رنگ نہیں آیا ہے اے یار! پھر ابھی سے چلنے کی بات کیوں چلاتے ہو)

ابن الرومی :۔ لم استتم عناقہ لقدومہ حتی ابتدأت عناقہ لوداعہ

(ابھی تو اس کے آنے کا معانقہ پورا نہیں ہوا تھا کہ جدائی کا معانقہ شروع کر دیا)

بہاری لال :۔ کوٹی تین کیجئے تنو، ناگری نیہہ دورین کہے دیت چیکنو، نئی رو کھائی نین

(اے چالاک! چاہے کتنی ہی تدبیر کرو لیکن محبت چھپتی نہیں، محبت بھرا دل اور آنکھوں کی نئی رو کھائی محبت کا پتہ دیتی ہیں)

علامہ بوصیری :۔ فکیف تنکر حبا بعد ما شہدت علیک عدول الدمع و السقم

(اب کیونکر محبت سے انکار ہو سکتا ہے جب کہ آنسو اور بیماری کے دو سچے گواہ شہادت دے رہے ہیں۔

بہاری لال :۔ اُٹھ ٹھک ٹھک لے تو کہا، پاوس کے انوسار جان پرے گے دیکھیوں، دامنِ گھن اندھیار

(اُٹھ بارش کے وقت پیا کے پاس چلنے میں اتنا اہتمام کیوں ہے، تجھے اگر کوئی دیکھ بھی لیگا تو سمجھے گا کہ بجلی چمک گئی)

فرغاء تسحب من قیام شعرہا ونغیب فیہ وھو شعر اسحم
فکانہا فیہ نہار مشرق فکانہ لیل علیہا مظلم

(زلف دراز والی معشوقہ کھڑے ہو کر اپنی زلف گھسیٹتی ہے اور سیاہ بالوں میں وہ چھپ جاتی ہے گویا وہ معشوقہ ان بالوں میں روشن دن ہے اور زلف تاریک رات)

بہاری لال :۔ پہرنہ بھوشن کنک کے، کہی آوت یہی ہیت درپن کے سے مورچے، دیہہ دکھائی دیت

(لوگ یہ کہتے ہیں کہ سونے کے زیور نہ پہن اس وجہ سے کہ آئینہ کی طرح جسم پر زیور مورچے کی طرح معلوم ہوتے ہیں مدعا یہ ہے کہ زیور سے اس کے جسم کی رونق نہیں ہے بلکہ زیور سے اس کے حسن میں نقص پیدا ہوتا ہے)

متنبی :۔ لبسن الوشی لا متجملات ولکن کی یصن بہ الجمالا

(معشوقہ نے زیور خوبصورتی کے لئے نہیں پہنا ہے بلکہ اس لئے کہ اس سے اپنے جمال کی حفاظت کرے)

مبارک بلگرامی:۔ چھوٹی الک جھلکت بدن، بڑھت مبارک مود — وے چرت چھونا ناگ کے، منو چندر کے گود

(اس کے لانبے بالوں کے اندر سے جسم ایسا جھلک رہا ہے جیسے چاند کی گود میں ناگ کے بچے مچل رہے ہوں)

عبداللہ بن عبداللہ بن طاہر:۔ سقتنی فی لیل شبیہ بشعرہا — شبیہۃ خدیہا بغیر رقیب

فمازلت فی لیلین من شعر ومن دجی — وشمسین من راح وخد حبیب

(معشوقہ نے اپنے زلف کی سی سیاہ رات میں بغیر رقیب کے اپنے رخساروں کے مشابہ چیز پلائی تو میں زلف اور تاریکی شب کی دو راتوں اور شراب اور رخسار معشوق کے دو سورج کے نیچے میں آگیا)

بہاری لال:۔ جہاں جہاں ٹھار و لکھیو، شام سو بھگ سرور — انہوں بن چھن گہی رہت، درگنی اجوں وہی ٹھور

(خوش نصیبوں کے سرتاج پہلے جہاں جہاں کھڑے ہوئے دیکھا تھا اب آنکھیں اس جگہ کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاتی ہیں)

امرؤالقیس:۔ کانی غداۃ البین یوم تحملوا — لدی سمرات الحی ناقف حنظل

(جدائی کی صبح کو جس دن وہ لوگ چلے گئے قبیلہ کے ببول کے درختوں کے قریب حنظل (اندرائن) کا توڑنے والا ہوں یعنی روتا ہوں)

بہاری لال:۔ کری برہ ایسی تو، گیل نہ چھاڑت نیچ، — دپنے ہوں چشمہ چکھن، چاہے لکھے نہ میچ

(اگرچہ صدمہ جدائی نے اس کو ایسا لاغر کر رکھا ہے کہ اگر موت چشمہ لگا کر بھی اس کو تلاش کرے تب بھی اس کو پا نہیں سکتی پھر بھی اسی وجہ سے وہ زندہ ہیں)

متنبی:۔ اراک ظننتِ السلک جسمی فعقتہ — علیک بدُرِّ عن لقاء الترائب

(میں دیکھتا ہوں کہ تو نے رشتۂ مروارید کو میرا جسم گمان کیا اس لئے ان موتیوں کو اپنے سینہ سے ملنے نہیں دیا)

بہاری لال:۔ نت سنشو ہنسو بچت، منو سوہی انومان — برہ اگن لپٹی نہ سکے، جھپٹ مچ سی جان

(اے سکھی! ہمیشہ یہی شبہ رہتا ہے کہ اسکی جان کیسے بچے گی لیکن یہ یقین ہے کہ جدائی کی آگ کی لپٹ سے موت اس کو جھپٹ نہیں سکتی)

دیک الجن:۔ لوان احداث الزمان ارونی — بخیر و شر ما عرفن مکانی،

(میں اتنا لاغر ہو گیا ہوں کہ اگر زمانہ کے حوادث بھلائی یا برائی کے لئے مجھ کو تلاش کریں تو میری جگہ نہ پائیں)

بہاری لال:۔ برہ بپتی دن پرت ہی، تجے سکھنی سب انگ — رہی اولمب دوکھی بھئے، چلا چل جیا سنگ

(اے سکھی! جدائی کی مصیبت کے دن پڑتے ہی تمام آسائشوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ ابتک تو دکھوں کا سہارا تھا لیکن جان کے ساتھ دکھ بھی اب جاتے ہیں)

متنبی:۔ وشکیتی فقد السقام لانہ — قد کان لما کان لی الاعضاء

مجھ کو اب بیماری کے چلے جانے کا گلہ ہے کیونکہ بیماری اسی وقت تک تھی جب تک میرے اعضا تھے یعنی شدتِ غم سے جب اعضا نہ رہے تو بیماری بھی نہ رہی۔

بہاری لال :۔ تیوں تیوں پیاسے ای رہت، جیوں جیوں پیت اگھائے سگن سلونے روپ کو، نہیں چکھ ترشا بوجھائے

(جیوں جیوں سیر ہو کر پیتے ہیں اسی قدر پیاسے ہی رہتے ہیں۔ اس کی ملاحت کو دیکھ کر آنکھوں کی پیاس نہیں بجھتی)

لیتنی اذا ارآہ کلی عیون، فبعینین لست اشبع منہ

(کاش میرے بہت سی آنکھیں ہوتیں کہ میں اس کو دیکھتا (صرف) دو آنکھوں سے میں سیر نہیں ہوتا)

بہاری لال :۔ کیوں بسئے کیوں بسئے، نیتی نیہہ پورنا ہیں، لگا لگی لوہیں کریں، ناحق من بندہ جاہیں

(کیوں کر قیام ہو اور کیونکر نباہ ہو محبت کی دُنیا میں انصاف نہیں آنکھیں تعلق پیدا کرتی ہیں دل ناحق گرفتار ہوتا ہے)

ابو تمام :۔ لاعذبن جفون عینی انما بجفون عینی جل ما اتعذب

(میری آنکھوں کو سزا دینی چاہئے کیونکہ تمام مصائب جو میں جھیل رہا ہوں میری آنکھوں کی وجہ سے ہیں)

بہاری لال :۔ بام باہو پھرکت لیں، جو جیوں موری، تو توہی سے بھیٹی ہوں، راکھ داہنی دوری

(اے بایاں بازو! تیرے پھڑکنے سے جو میرا سرمایہ زندگی ملجائے تو داہنے بازو کو دور رکھ کر تجھ ہی کو گلے لگاؤں گی)

عباس :۔ ظلت تبشرنی عینی اذا اختلجت بان اراک وما زالت علی خطر

فقلت للعین اما کنت صادقۃ انی ابشراک لی من اسعد البشر

فما جزاک عندی لست اعرفہ بلی جزاؤک ان تحلین بالنظر

واحجت المقلۃ الاخری وامنعہا وجہ الحبیب کمالم تات بالخبر

(میری آنکھ کے پھڑکنے نے یار سے ملنے کی بشارت دی مجھے یہ نہیں معلوم کہ میں اس کا کیا بدلہ دوں گا اس کا بدلہ یہی ہے کہ جس آنکھ کے پھڑکنے سے یار ملیگا میں اسی آنکھ کو یار کے چہرہ کو دیکھنے دوں گا اور جو آنکھ نہیں پھڑکی اُس کو روک دوں گا)

بہاری لال :۔ للن چلن سنی پلن میں، انسوا جھلکے آئے بھئی لکھاین سکھن ہوں، جھوٹھے ہی جمہائے

(پیارے کا جانا سنتے ہی پلکوں میں آنسو جھلکنے لگا سکھیوں پر ظاہر نہ ہوا کیونکہ میں جھوٹی جمہائی لینے لگی)

ابو العتاہیہ :۔ ولما ابت عیناک ان تکتما البکا، وان تحبسا فیض الدموع السواکب

تشاءبت کی لا تنکر الدمع منکر ولکن قلیلا ما بقاء التشاءب

(جب میری دونوں آنکھوں نے گریہ چھپانے سے انکار کیا اور آنسوؤں کے جاری ہونے کو روک نہ سکیں تو میں نے جمہائی لی تاکہ کوئی منکر آنسو سے انکار نہ کرے لیکن تھوڑی ہی دیر جمہائی باقی رہی اور راز فاش ہو گیا)

(شمس العلماء) **محمد امین عباسی** (مولوی فاضل)

ضروری اطلاع

جواب کے لئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔ منیجر نگار

ترقی پسند ادب، ادب نہیں، صحافت ہے

(۱)

اُردو میں جب "ترقی پسند" ادب کا ظہور ہوا تو ہمارے پُرانے ادیبوں نے چھوٹتے ہی کہا کہ یہ "ادب نہیں ہے، کوئی اور چیز ہے" ترقی پسندوں نے ان کو یہ کہکر خاموش کر دیا کہ یورپ میں یہی چیز ادب کہلاتی ہے اور ہمارے ادب کو اسی راہ پر آنا ہوگا نہیں تو وہ فنا ہو جائے گا۔ اس کا جواب ہمارے پُرانے ادیب نہ دے سکتے تھے کیونکہ انھیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ یورپ کا جدید ادب کیا ہے اور یورپ کے جس نئے ادب کو ہماری زبان میں پیش کیا جا رہا ہے اس کو یورپ کے عالمان ادب کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء میں فرانس میں یہ طے کیا گیا کہ ایک "ترقی پسند" ادب کی بنیاد رکھی جائے اور کچھ خاص سیاسی نظریوں کو سامنے رکھکر "ترقی پسندی" کو دُنیا کے ہر ملک میں پھیلایا جائے۔ اس تحریک کی بنا پر دُنیا کے ہر ملک میں، اور ہر زبان میں ترقی پسندی کی بنیاد ڈالی گئی اور ایک نئے قسم کا ادب ظہور میں آنے لگا جسکے بابت ہر ملک کے پُرانے ادیبوں نے یہی کہا کہ یہ ادب نہیں ہے اسلئے اگر محض اُردو کے پُرانے ادیبوں کی یہ رائے ہوتی تو شاید اس کی کوئی زیادہ اہمیت نہ ہوتی مگر چونکہ دُنیا بھر کے ادیب اس معاملہ میں یکساں رائے ہیں اس لئے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یہ ادب چاہے اور جو کچھ بھی ہو ادب نہیں ہے کیونکہ اس میں وہ صفت نہیں ہے جس کو اب تک تمام دُنیا کے لوگ ادبیت کہتے آئے ہیں اور اس باب میں ان سب کی رائیں ایک ہیں جن کو ادب کہا جاتا ہے۔

مجھے صحیح ترقی پسندی پر کامل عقیدہ ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ پُرانی راہیں ایک حد تک پہونچنے کے بعد ناکارہ ہو جاتی ہیں اور ہر دور میں نئی راہیں اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ میں انگریزی اور اُردو نئے ادب کی طرف خاص طور پر اور تمام یورپ کے نئے ادب کی طرف عام طور پر اسی لئے متوجہ ہوا تھا کہ اس میں ادب کی ترقی نظر آئے گی اور ایک سچا نیا ادب دکھائی دے گا۔ مگر اس بارہ برس کے اندر جو میں آئے ہوئے ادب کو دیکھ کر مجھے عجیب احساس ہوا اور میں اس نتیجہ تک پہونچنے پر مجبور ہوا کہ یہ ادب، ادب نہیں ہے بلکہ صحافت ہے۔ مجھے اس سے نفرت نہیں ہے جیسے مجھے روزناموں وغیرہ سے نفرت نہیں ہے مگر میں اس میں وہ کیف اور وہ اثر نہیں پاتا جو ہر اچھے ادب میں ہونا چاہئے بلکہ اس میں وہ سطحیت، وہ وقتی اثر، وہ عامیانہ جذباتیت، وہ پروپاگنڈا اور وہ سب باتیں ہیں جن کو ادب کی جگہ صحافت سے منسوب کرنا زیادہ مناسب ہے۔

(۲)

ترقی پسند ادب ایک خاص ذہنیت کا آئینہ دار ہے جو موجودہ تعلیم کے اثر سے ظہور میں آئی ہے۔ یہ ذہنیت تمام دُنیا کے ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو ترقی پسندی کی طرف مایل ہیں ـــــ اس ذہنیت کا خیال آتے ہی مجھے اپنا ایک شاگرد یاد آتا ہے جس کی یہ ذہنیت

ایک روز بڑی اچھی طرح نمایاں ہوئی۔ میں ایک دن شکسپیر کی ٹریجیڈی میکبتھ کو ختم کرانے کے بعد موضوع ٹریجیڈی پر لکچر دینے والا تھا کہ انھوں نے کہا کہ "میکبتھ" "ٹریجیڈی تو ہی نہیں کمیڈی ہے" میں نے سبب پوچھا تو صاحبزادے بولے کہ "اس ڈرامہ کا خاتمہ طرب پر ہوتا ہے"۔ میں نے کہا: "جو اس ڈرامہ کا ہیرو ہے وہ تو مارا ہی جاتا ہے اور پھر اسکی زندگی یوں بھی شروع سے آخر تک غم واندوہ سے بھری ہے ان سب حالات پر نظر رکھتے ہوئے یہ ڈرامہ ٹریجیڈی ہی کہلائے گا" ان صاحبزادے نے کہا: "مگر ہم میکبتھ کو ہیرو مانیں ہی کیوں میلکم ہیرو ہے اس ڈرامہ کا"۔ اس پر ان کو میں نے سمجھایا کہ "ہر قصہ کا ہیرو وہی ہوتا ہے جو قصہ کے لحاظ سے سب میں زیادہ اہلیت رکھتا ہو ملکم کا پارٹ تو اس قدر کم ہے کہ اسکے کردار کی کوئی خاص خصوصیت بھی نمایاں نہیں ہوتی وہ ہیرو کیسے ہو سکتا ہے"۔ غرض اسی طرح وہ پورا گھنٹہ میں نے ان صاحبزادے کو سمجھانے ہی میں گزار دیا تاکہ دوسرے لڑکے ان کی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ مگر وہ صاحبزادے آخر تک اسی پر اڑے رہے کہ یہ ڈرامہ کمیڈی ہی ہے۔ ان صاحبزادے کی ذہنیت اس خاص ذہنیت کی مثال ہے جو ترقی پسند ادیبوں میں نظر آتی ہے اور ہر ملک و قوم کے ترقی پسندوں میں عام طور پر موجود ہوتی ہے۔ یہی ذہنیت انگلستان کے اس ترقی پسند کی تھی جس نے ملٹن کے ترنم کو محض شور کہا یا اس کی جس نے شیکسپیر کے ہاملیٹ کو فنی نقطۂ نظر سے ناکامیاب کہا۔ لیکن کسی بات کو غلط سمجھنا اور اس پر جمے رہنا یہ بیماری ہمارے ملک اور ہمارے ترقی پسندوں میں زیادہ شدت سے نمایاں ہے یورپ کے ترقی پسند سیاہ رنگ کو دھندلا اور سفید کو بادامی ہی کہنے پر اکتفا کرتے ہیں مگر ہمارے ترقی پسند سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید منوانے ہی پر تلے ہیں۔

پروفیسر کیلٹ (KELLET) نے اپنے لکچروں میں ایک جگہ کہا ہے کہ "ان نئے ادیبوں کی مثال اس لومڑی کی سی ہے جس کی دم ایک جال میں رہ گئی تھی اور اس کے بعد سے وہ تمام لومڑیوں کو جمع کر کے یہ وعظ کرنے لگی کہ دم جسم کا بے ضرورت اور فضول حصہ ہے اور اس کو کٹوا دینا بہت مفید ہوگا"۔ کیلٹ کی مثال کو ہمارے ترقی پسندوں پر چسپاں کرنے کے لئے اس میں ایک ترمیم ضروری ہے وہ یہ کہ ہمارے یہاں کی لومڑی نے کسی جال میں اپنی دم نہیں کھوئی بلکہ یورپ کی دم کٹی لومڑی کے کہنے پر اپنی دم کٹوا دی اور اس کے ساتھ ایک کافی گروہ اس عمل پر ایمان لایا۔

اس ترقی پسند ذہنیت نے ہماری سوسائٹی میں گوناگوں صورتیں اختیار کی ہیں۔ ان میں سے تین صورتیں خاص ہیں۔ ایک صورت تو ان لوگوں کی ہے جو تمام تر سائنسی تعلیم حاصل کئے ہوئے ہیں۔ عام طور سے ہندوستان میں سائنس کے طلاب کو اپنے درسی مضامین میں اسقدر مستغرق رہنا پڑتا ہے کہ ان کا دنیا کی باتوں کی طرف دھیان ہی نہیں ہوتا اس لئے عام معاملات پر ان کی رائیں ہمیشہ نہایت نیچے درجہ کی ہوتی ہیں اور ان کو ترقی پسندی کے دائرے میں جلد لے آتی ہیں۔ سائنس یا تحقیق سے ادب کو ضرور مدد لینا چاہئے مگر جو شخص عام فلسفۂ ادب اور عام فلسفۂ سائنس کو جانتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ دونوں علم ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ ہمارا سائنس کا اعلیٰ ترین عالم بھی فلسفۂ سائنس سے ناواقف ہوتا ہے اور ادب کے فلسفہ سے تو خیر اس کو کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے جب وہ ترقی پسندی کے میدان میں آتا ہے تو عجیب عجیب مجدید نظریئے پیش کرتا ہے۔

ترقی پسندی کی دوسری قسم ان صاحبزادوں کی ہے جو علوم و ادب مشرقیہ میں اعلیٰ ڈگری رکھتے ہیں۔ ان علوم کی طرف وہ کسی ذوق یا رجحان طبیعت کی بنا پر متوجہ نہیں ہوئے تھے بلکہ اس لئے کہ ان میں حصول سند آسان ہے۔ یہ ادب مشرقیہ میں پرانے زمانہ کے ہندی سے

بھی کہیں زیادہ پیچھے ہوتے ہیں - ان کا طریقہ یہ ہے کہ مغربی علوم کے جاننے والوں میں یہ مشرقی علوم کے علم پر فخر کرتے ہیں اور مشرقی علوم کے جاننے والوں میں اپنے کو مغربی علوم کا عالم بتاتے ہیں۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو تعلیم یافتہ تو ہوتے ہیں مگر ان کو تعلیم سے یا اس کے کسی شعبہ سے کوئی غرض نہیں ہوتی - یہ لوگ اگر رئیس زادے نہیں تو رئیس مزاج ضرور ہوتے ہیں اور یہ اپنے آپ کو صرف اس لئے ترقی کا علمبردار کہتے ہیں کہ لوگ ان کو واقعی پڑھا لکھا سمجھیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد زمانہ کے ساتھ ساتھ نئی راہ اختیار کر لینے کی ذہنیت نے عجیب عجیب گُل کھلائے۔ فرانس میں جہاں سے اس تحریک کی ابتدا ہوتی ہے وہاں ان شاعروں نے جو اس تحریک میں پیش پیش تھے اب حکومت کے عہدوں کو سنبھال لیا ہے اور ترقی پسندی کے تمام اصول توڑ رہے ہیں۔ ہندوستان کے وہ ترقی پسند جو ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر تھے اب پاکستان میں براجمان ہو کر "پاکستان پائندہ باد" کے نعرے لگا رہے ہیں، سُنا ہے حیدرآباد میں اکثر ترقی پسند رضاروں کے شریک ہو گئے تھے اور عوام پر ظلم و تشدد میں پیش پیش تھے۔

(۳)

تصنیفات ہر ملک اور ہر زمانہ میں دو قسم کی ہوتی آئی ہیں ایک وہ جن سے علماء اور اہلِ ذوق کو تفریح ہوتی تھی اور دوسری وہ جو عوام میں مقبول ہوتی تھیں۔ اول قسم کی تصنیفات کو ادب کہا جاتا تھا اور ان سے لطف اندوز ہونا ہر شریف لڑکے کے اخلاق میں شامل سمجھا جاتا تھا ساتھ ہی ساتھ پست درجہ کی تصانیف سے نفرت بھی اعلیٰ اخلاق کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم کا اب تک یہی اصول ہے۔ بہترین ادب پارے لڑکوں کے سامنے رکھے جائیں تاکہ ان کے ذوق کی عمدہ تعمیر ہو۔ اب تک ہر درجہ کا نصاب طیار کرتے وقت اس چیز کا دھیان سب سے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس زمانہ میں عوام میں محض خواندگی پھیلانے کی تحریک نے ایک طرف اور ان محض خواندہ لوگوں کے مطالبات نے دوسری طرف بہت کثرت سے ایسی تصانیف کا مسلسل وجود قایم کر دیا ہے جو پست درجہ کی ہیں، ترقی پسند ذہنیت چونکہ عوام کی طرف زیادہ متوجہ ہے اسلئے اس کو یہ پست ادب ہی پسند آتا ہے اور سفید کو سیاہ ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اگر آپ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے کہ ترقی پسندوں کا مذاق کس قسم کا ہے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کے نزدیک اعلیٰ شاعر وہ ہے جس کے خیالات پست اور طرز ادا عامیانہ ہو اور اعلیٰ ناول نگار وہ ہے جو محض جذباتیت اور پست احساسات کو سطحی طریقہ سے اُبھار کر کچھ دیر کی تفریح بہم پہونچاتا ہے اُردو کے تمام ترقی پسند ادیب اسی قسم کے ادب سے مستفید ہوتے ہیں اور اسی قسم کے ادب کو نمونہ قرار دیکر وہ ہمارے ادب میں کم زور اضافے کر رہے ہیں۔

بعض ترقی پسندوں کا یہ حال ہے کہ وہ صحیح و پست ادب میں تمیز کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ مثلاً ایک صاحب نے مجھ سے ایک بار کہا کہ "میری کوریلی کی ناولوں کی بابت آپ مجھے بتائیے" میں نے جواب دیا کہ "میں ان کی بابت ایک بات جانتا ہوں اور وہ یہ کہ یہ ادب کے درجہ سے گری ہوئی ہیں"۔ یہ بات ان کو بہت شاق گزری اور فرمانے لگے "ان میں اتنے اچھے پلاٹ ہیں اتنے اچھے کردار اور اتنی اچھی زبان"۔ میں نے کہا کہ "آپ کو ناول کے ادبی اور غیر ادبی خصوصیات کا فرق ہی نہیں معلوم"۔ ان صاحب کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ایک ترقی پسند ادیب نے یہ بھی فرمایا "ہم اس قسم کا کوئی فرق کرنے کو تیار نہیں ہیں، یہ پرانے ادیبوں کا توہم ہے"۔

بعض ترقی پسند ایسے بھی ہیں جو پست تصنیفات کو پست کہتے ہیں اور اپنے ادب کو اس سے بالاتر بتاتے ہیں۔ ایک صاحب جو مکمل ترقی پسند تو نہیں بلکہ ترقی پسندوں کے کافی ہمدرد ضرور ہیں انھوں نے فرمایا کہ "ہم ابھی ادب کا درجہ پست کر کے پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ عوام تک پہونچے اور جب عوام کا ذوق اونچا ہو جائے گا تو یہ ادب بھی اونچا ہو جائے گا" اس کے بعد ان صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ایک روسی ترقی پسند نے یہ نظریہ پیش کیا ہے اور اس کی کتاب پڑھنے کو مجھ سے کہا۔ لیکن مجھے تو اس عمل سے پست ادب کے اعلیٰ ہو جانے کے بجائے اعلیٰ ادب کے بالکل فنا ہو جانے کا زیادہ امکان نظر آتا ہے۔

(۴)

جن اصولوں پر ترقی پسند چل رہے ہیں اور جن اصولوں کے تحت وہ اپنی تصانیف کو پیش کر رہے ہیں وہ بالکل غیر ادبی اور تمام تر صحافتی ہے ادب اور صحافت میں اہم فرق یہ ہے کہ ادب جو تمنا اور خلوص پر مبنی ہوتا ہے اور صحافت کا مقصود ہے اپنے مخصوص نظریے (وہ ادبی ہوں سیاسی ہوں، معاشی ہوں یا نفسیاتی) عوام میں پھیلانا ہو ان دو مختلف نظریوں سے ادب میں بڑا فرق ہو جاتا ہے کیونکہ اول نظریہ نہایت گہرا اور بلند ہے اور دوسرا نہایت سطحی و پست۔

متعدد ادیبوں کا ایک رائے ہونا اور ادب کی از سر نو تشکیل کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے اور بیشتر مفید ثابت ہوئی ہے مگر ادیبوں کا ایک دفتر قائم کر کے اپنی تمام انفرادیت کو فنا کر دینا ادیبوں کا نہیں بلکہ اخبار نکالنے والوں کا مشرب ہے۔ ترقی پسند ادیب یہ کہتے ہیں کہ تاریخ ادب کے ہر دور میں ایک جماعت بندی ملتی ہے۔ یہ ان کے نہایت سطحی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تاریخ ادب کے مطالعہ کے سلسلہ میں ابن مختصر تاریخوں سے آگے نہیں بڑھے جن میں اختصار کی وجہ سے ہر دور کے شعرا ایک جتھے کے مختلف فرد معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کسی ادب کی تاریخ کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر نئے دور میں کچھ شاعروں نے ادب کے طرز کو بدلنے کی کوشش کی مگر ان میں سے ہر ایک نے اپنے انفرادی خیالات اور اپنی خاص طرز کو الگ ہی رکھا۔ یورپ میں انیسویں صدی کی رومانی تحریک کو لے لیجئے۔ یہ فرانس میں روسو سے شروع ہوتی ہے اور تمام یوروپ میں کسی پروپاگنڈا کی بنا پر نہیں بلکہ آپ ہی آپ پھیل جاتی ہے۔ انگلستان میں کولرج اور ورڈسورتھ یکجا ہو کر روسو کے فلسفہ کے مطابق شاعری میں کچھ جدتیں پیدا کرنے کی ٹھانتے ہیں۔ مگر شروع کرتے وقت ہی ان کی رائیں جدا جدا ہو جاتی ہیں اور آگے بڑھ کر یہ ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہو جاتے ہیں۔

تمام رومانی شاعر نیچر کے دلدادہ ہیں مگر ہر ایک بالکل اپنے طریقے پر دوسرے سے بالکل مخالف نیچر کو پیش کرتا ہے برخلاف اس کے ترقی پسندوں کی جماعت پر غور کیجئے۔ ان کا ہر شاعر ہر افسانہ نگار ہر نقاد ایک ہی بات کہتا ہے۔ یہ جماعت ادیبوں کی نہیں معلوم ہوتی بلکہ کسی روزنامہ کے دفتر میں مختلف کاموں پر مقرر کئے ہوئے سب اڈیٹروں کی جماعت معلوم ہوتی ہے۔ ادھر دنیا میں کسی واقعہ کی خبر آئی نہیں کہ ترقی پسند پالیسی کے موافق اس پر نظم۔ افسانہ۔ مضمون۔ خاکہ سب کچھ تیار ہو گیا اور ترقی پسند نقاد نے ان سب کو اعلیٰ ترین ادب میں جگہ دے دی۔ اسی طرح یہ جماعت ہر ملک میں اپنی ایک مشین رکھتی ہے جس کے سب پرزے اپنی اپنی جگہ پر کام کرتے رہتے ہیں۔ یہ عمل بالکل صحافتی اصول کے مطابق ہے اور ادبی اصول سے علیحدہ ہے۔

ان کا ایک اصول جس کا یہ لوگ بہت زیادہ ڈھنڈھورا پیٹتے ہیں "ادب برائے زندگی" کا اصول ہے وہ "ادب برائے ادب" کے سخت مخالف ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو دُنیا کے بڑے اور بلند پایہ شاعروں نے ان دونوں اصولوں پر ایک ساتھ عمل کیا ہے۔ اصل میں یہ دو الگ الگ اُصول ہی نہیں — ان کو الگ الگ ان کم بضاعت شاعروں نے اُنیسویں صدی کے آخر میں کیا جو شاعری کی حقیقت سے دور جا پڑے تھے۔ اُردو میں دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول ان دونوں الگ الگ اصولوں پر چلے مگر دہلی اور لکھنؤ کے بہترین شاعر وہی ہیں جنکے یہاں دونوں اصول برابر برابر ملتے ہیں۔ اصل میں ہر بڑے ادیب کا ادب فطری طور پر برائے زندگی ہوتا ہے اور وہ شعوری طور پر اسکو برائے ادب بھی بنا دیتا ہے۔ مگر ترقی پسندوں کے یہاں زندگی کے وہی معنی ہیں جو اخبار والوں کے یہاں ہوتے ہیں یعنی روز کے واقعات زندگی۔ یہ لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ ادیب بھی زندگی کے واقعات سے متاثر ہوتا ہے مگر ان واقعات کو وہ سطحی، وقتی یا مقامی درجہ سے اُٹھا کر اپنے گہرے اور ہمہ گیر درجہ پر لے جاتا ہے۔ ارسطو نے ادب کی بابت ایک دائمی حقیقت یہ بتائی تھی کہ اسی کو اعلیٰ حق نمائی سے سروکار ہوتا ہے کیونکہ یہ ہمہ گیر حقیقتوں سے سروکار رکھتا ہے۔ برخلاف تاریخ کے جو مخصوص اوقات اور مخصوص مقامات کی حقیقتوں ہی پر اکتفا کرتی ہے۔ ترقی پسند اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے مگر اس پر عمل کرنے سے شاید قاصر ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر سال کا ترقی پسند ادب دوسرے سال کے لئے بیکار ہو جاتا ہے۔

پھر اس سطحی زندگی کے علاوہ ان کے یہاں زندگی کی جو قدریں نظر آتی ہیں وہ ان کے ادب کو زندگی سے دور لیجا کر کسی سائنس دان کی تجربہ گاہ میں بند کر دیتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شاعر کے کلام پر خاص خاص فلسفوں اور نظریوں کا اثر ہونا ضروری ہے شاعر کبھی اپنی نئی قدریں نہیں بناتا اگر وہ کسی کی بنائی ہوئی قدروں کا غلام ہو جائے تو اپنے تجربۂ زندگی سے دور ہو جائے اور اس کا ادب زندگی سے کہیں چھو کر بھی نہ گزرے بلکہ ادب برائے مارکسیت یا ادب برائے فرائڈیت ہو کر رہ جائے اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ عوام جن کی زندگی بلند کے لئے یہ وجود میں آتا ہے ان کے لئے یہ بھی بہت مبہم ہے ادب کو ان نظریوں کے تحت اختیار کرنا ادب کو ترقی دینا نہیں ہے بلکہ اُس کو قرونِ وسطیٰ کے اُس ادب کی طرف لے جانا ہے جو زندگی کو مذہبی مسایل میں جکڑا ہوا پیش کرتا تھا کیونکہ جس طرح پہلے ادب مذہب کی تبلیغ ہوتا تھا اسی طرح ترقی پسند ادب اشتراکیت کا پروپاگنڈا ہے۔

اگر فرائڈ کے نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد ترقی پسندوں کی فرائڈیت کی طرف نظر کیجئے تو طرفہ تماشہ نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فرائڈ نے جنسیاتی محرکات پر بہت زور دیا ہے۔ مگر جنسیاتی کشمکش کے علاج کے سلسلہ میں اس نے دو طریقے بتائے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر کوئی اس کشمکش میں مبتلا ہو تو اس کا دھیان عریانی اور فحاشی کی طرف رجوع کرو دوسرا یہ کہ اس کا دھیان اعلیٰ نصب العین کی طرف مایل کرو مگر ترقی پسند ادیب دوسرے طریقۂ علاج کی طرف کبھی دھیان ہی نہیں کرتا شاید اس لئے کہ ہماری پرانی شاعری میں عشق مجازی کا عشق حقیقی میں تبدیل ہونا اس دوسرے علاج کے موافق تھا اور اس ذریعہ سے علاج کی طرف توجہ کرنا ان کے نزدیک رجعت پسندی ہے۔

ادب برائے زندگی کے سلسلہ میں ترقی پسند ایک اور اصول پیش کرتے ہیں یہ ٹالسٹوئے کا اصول کمیونی کیشن COMMUNICATION ہے ٹالسٹائے کا مقصد یہ ہے کہ ادیب ادب کو محض اپنی تسکین کے لئے نہیں پیدا کرتا بلکہ اس کا دھیان ان لوگوں کی طرف بھی ہوتا ہے جن کے لئے

وہ ادب تخلیق کر رہا ہے۔ یہ مسئلہ ایک بڑی گہری حقیقت کا انکشاف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب کا تعلق سوسائٹی سے ہے اور شاعر کی کوشش شعوری یا لاشعوری طور پر یہی ہوتی ہے کہ اپنے احساسات یا جذبات کو سوسائٹی کے سامنے لائے مگر ہر بڑے ادیب کے کلام کا ایک پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ادبیت کو ہاتھ سے نہ جانے دے مگر ترقی پسندوں کے نزدیک ٹالسٹوئے کے نظریہ کو یہ معنے دینا ان کی غلطی ہے کیونکہ ٹالسٹوئے نے خود اپنی ناولوں میں کہیں اس اصول کو اس صورت میں نہیں برتا۔ یوں تو ہر ناول سے کوئی نہ کوئی نظریۂ زندگی نکلتا ہی ہے مگر پہلے کسی نظریہ کو قایم کر لینا اور پھر اس پر ناول کی بنیاد رکھنا مناسب نہیں ٹالسٹوئے کا اصول یہ نہ تھا ورنہ وہ دنیا کے بہترین ناول نہ لکھ سکتا۔ اصل یہ ہے کہ ترقی پسندوں کے لئے ترقی پسندی اصل چیز ہے اور اس کو زندہ کرنے کیلئے دوسری چیز کو مٹا دینے کی کوئی پروا نہیں کرتے۔

ارسطو کے زمانہ میں خطابت کو وہ جگہ حاصل تھی جو آجکل صحافت کو حاصل ہے۔ ارسطو ان دونوں فنوں کو الگ الگ سمجھتا تھا اور اسی لئے اس نے ان دونوں کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ خطابت کا مقصد جذبات کو اُبھارنا۔ شاعری کا مقصد جذبات کی اصلاح کرنا ہے اور ان میں توازن پیدا کرنا۔ اس لئے ترقی پسندوں کے تمام نظرئے بوطیقا سے الگ ہو کر اگر کہیں جگہ پاتے ہیں تو خطابت کے دائرے میں اور انکی جگہ صحافت میں ہے نہ کہ ادب میں۔

(۵)

ہر ادب کی شاعری ہی اس ادب کا نچوڑ ہوتی ہے اس لئے ترقی پسندوں کی شاعری بھی ان کی تمام اصولوں کی آئینہ دار ہونا چاہیئے اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی تحریک ہی انکی اصل زندگی ہے اور اس سلسلہ میں جو نئے اسالیب برتے جا رہے ہیں۔ ان سے انکی پست نظری اور کج فہمی نمایاں ہے۔ اپنی روایات سے بدظنی اور دوسرے ملک کی روایات کو اپنے ادب میں داخل کرنا کوئی بری بات نہیں۔ مگر اس کے لئے جو علم و فکر ضروری ہے وہ ہمارے اُردو داں ترقی پسندوں میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں اور اسی لئے انکی شاعری ایک ایسی چیز ہو گئی ہے جس کو وہ خود ہی سمجھ سکتے ہیں

شاعری میں عروض بہت اہم چیز ہے۔ پرانے ادیب یہ سمجھتے ہیں کہ ترقی پسند شاعر یورپ کے عروض کو اُردو میں رائج کر رہے ہیں۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اگر یورپ کا عروض ہماری شاعری میں خوب اچھی طرح سمجھ بوجھ کر برتا جائے تو کوئی مضایقہ نہیں ہے۔ مگر ہمارے ترقی پسند شاعر نہ تو عربی عروض ہی سے واقف ہیں اور نہ انگریزی سے۔ ان کی عربی عروض سے ناواقفیت کے بابت تو بہت کچھ کہا جا چکا ہے یہاں میں انکی انگریزی عروض سے ناواقفیت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں —— ہمارے نئے ادب میں ایک خاص قسم کی نظمیں ہر مہینہ رسالوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں کسی عروض کی پابندی نہیں کی جاتی بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ علم عروض کو توڑنے ہی کے لئے لکھی جاتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عروض کی پابندی شاعر پر بار ہوتی ہے مگر شاعری کا حُسن زیادہ تر اسی پابندی میں ہے۔ اس لئے عروض کی آزادی کے معنے یورپ میں یہ لئے جاتے ہیں کہ اگر کوئی پرانی پابندی توڑی جائے تو کوئی نئی پابندی عاید کر لی جائے۔ ہمارے شاعروں نے آزادی کے معنے بے راہ روی لئے ہیں۔ یقیناً انگریزی نظموں میں بھی مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں اور قافیہ بھی ضروری نہیں ہوتا مگر یہ سب باتیں کس اصول کے تحت ہوتی ہیں —— اصل میں انگریزی فری ورس ایک ایسے اہم اصول کی پابندی ہے جس پر

عمل ہمارے کسی ترقی پسند شاعر کے بس کی بات نہیں۔ مثال کے طور پر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی فری ورس لیجئے۔ یہاں ظاہرا ہر قسم کی عروضی آزادی ہے مگر موسیقی کے اصول MOVEMENT کی نہایت سختی سے پابندی ہے۔ اس کے یہاں مصرعوں کی لمبائی۔ قافیوں کا وجود یا فقدان اور پورے ٹکڑوں کا وجود ایک مکمل MOVEMENT کے تحت ہوتا ہے۔ ترقی پسندوں کے یہاں اس چیز کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے اسلئے ان کی آزاد نظم سرے سے نظم ہی نہیں ہوتی۔ انگریزی ترقی پسند شاعری عروضی لحاظ سے کامیاب ہے کیونکہ اگر وہ ایک اصول کو توڑتی ہے تو دوسرا اصول ایجاد کر لیتی ہے مگر ہمارے ترقی پسند شعراء بالکل بے لگام ہیں۔ انگریزی زبان کا ایک قدرتی وزن مقرر ہو گیا ہے۔ انگریزی کی تمام بڑی نظمیں اسی وزن پر ہیں لیکن ہمارے ترقی پسند شعرا اس کو نہیں سمجھتے۔

(۶)

افسانوی ادب میں تو ترقی پسند ادب بالکل صحافت کے درجہ پر آگیا ہے۔ ترقی پسندوں کو یہ دعوے ہے کہ اردو افسانے کو انھوں نے تمام دنیا کے ترقی پسند افسانوں کا ہم پلہ بنا دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے ترقی پسند افسانوں سے ہمارے افسانے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ مگر ادبی نہ وہ ہیں نہ یہ ہیں۔ چیخوف۔ او ہنری۔ گنتھرین۔ کیلنگ۔ موپساں۔ گورکی وغیرہ کے افسانوں سے ان ترقی پسند افسانوں کا کوئی نسبت نہیں ہے ان میں صحافت کی وہ صفت جسے TOPICALITY کہتے ہیں اس قدر زیادہ نمایاں ہوتی ہے کہ ان کا کوئی ادبی اثر محسوس ہی نہیں ہوتا اس میں شک نہیں کہ ان کی تراش خراش بالکل درست ہوتی ہے۔ ٹکنیک کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے لیکن ان کی حیثیت اخباری افسانوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔

افسانوی ادب دوسرے اصناف سے زیادہ زمان و مکان کا پابند ہوتا ہے۔ یہ زمان و مکان بھی ادبی افسانوں میں اس نوعیت سے پیش کئے جاتے ہیں کہ ان کی اہمیت آفاقی ہو جاتی ہے۔ ہماری اردو میں اگر کوئی افسانہ نگار پورے طور پر کامیاب نظر آتا ہے تو وہ پریم چند ہے۔ پریم چند کا ہر افسانہ زندگی کا جیتا جاگتا ٹکڑا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پریم چند کے افسانے پرانے طریقے کے ہیں لیکن نئے طریقے سے جو افسانے لکھے جاتے ہیں وہ بے نتیجہ ہوتے ہیں کیونکہ ترقی پسند افسانہ نگار کو کسی شعبۂ زندگی سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا اور اسکا مقصد کسی ایسے TOPIC کو واضح کرنا ہوتا ہے جو دیرپا نہیں ہوتا

(۷)

تنقید کے سلسلہ میں بھی ترقی پسندوں کو بہت سراہا جاتا ہے لیکن چونکہ خاص قسم کی قدروں کی تبلیغ انھیں منظور ہے اسلئے وہ criticism نہیں ہوتی بلکہ صرف تبصرہ comment ہو جاتی ہے۔

پہلے یورپ میں نقاد کے لئے جو خصوصیات ضروری سمجھی جاتی تھیں وہ یورپ کے موجودہ نقادوں میں بھی نہیں پائی جاتیں، چہ جائیکہ ہمارے نقاد۔ اُنیسویں صدی تک نقاد کے لئے اپنے ادب اور اپنے ادب سے وابستہ ہونے والے روایات کے ساتھ ساتھ تمام ادبوں کا عالم ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا ورنہ اس کی رائے کو وقعت نہیں دیجاتی تھی۔ سو یورپ کا نقاد تو اپنی تحریک کے تمام اصول اور ان سے متعلق تمام تصنیفات سے پورے طور پر واقف ہوتا ہے مگر ہمارے یہاں کا ترقی پسند نقاد یہ واقفیت نہیں رکھتا۔

نقاد کی ایک بڑی ضروری صفت ہر دور اور ہر ملک میں یہ مانی جاتی تھی کہ وہ شعر کو یا ادب پارے کو پرکھ سکے اور اسکی قیمت بتا سکے۔ جیسے جوہری کسی جواہر کو دیکھ کر اس کا پانی، اس کی اصلیت اور اس کی قیمت بتا دیتا ہے اسی طرح نقاد کو بھی ادب پارے کی بابت اس قسم کا اندازہ کرنے کا اہل ہونا چاہیئے ترقی پسند نقاد جوہری کی آنکھ نہیں رکھتا اور نہ تجربہ۔

اُردو کے ترقی پسند نقاد نے دنیائے تنقید نگاری میں تین طریقوں کا اضافہ خاص طور سے کیا ہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) جو منہ میں آئے بے سوچے سمجھے کہے جاؤ۔ اگر کسی ترقی پسند کے بابت کچھ کہنا ہو تو لہجہ قصیدہ کا ہونا چاہیئے اگر کسی غیر ترقی پسند کے بابت کچھ کہنا ہے تو مرثیہ طنز کافی ہے۔ یہ طریقۂ تنقید زیادہ تر ترقی پسندوں میں عام ہے اور آسان ہونے کی وجہ سے ہر شخص اختیار کر لیتا ہے۔

(۲) سب کچھ کہو مگر کچھ بھی کچھ نہ کہو۔ مثلاً نقاد کہے "ہیں تو اس نظم میں خوبیاں بھی اور خامیاں بھی مگر مجملاً اچھی ہی چیز ہے" یا یہ کہے "اس کی بابت آپ کی رائے اس امر پر مبنی ہوگی کہ آپ کس نقطہ سے اس کو دیکھتے ہیں" یا یہ کہے "چیز تو اہم ہے مگر اس کے متعدد پہلو ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ غور کرنے کی ضرورت ہے جب اس پر مطلق رائے دی جا سکتی ہے۔ اس قسم کی تنقید وہ ہوتی ہے جس میں کہا تو بہت کچھ جاتا ہے مگر مطلب کچھ نہیں ہوتا۔

(۳) تیسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی چیز کی بابت اس وقت تک رائے نہ دی جائے جب تک اس کی بابت متعدد رائیں نہ جمع ہو جائیں۔ جب یہ سب رائیں جمع ہو جائیں تو ان میں سے ہر ایک سے کچھ اختلاف اور کچھ موافقت کی جائے اور اسی طرح بڑھاتے بڑھاتے اتنا طویل مضمون لکھدیا جائے کہ پڑھنے والا پریشان ہو جائے۔

تنقید کے سلسلہ میں ایک بڑی پر لطف بات یہ ہے کہ یورپ میں بھی اور یہاں بھی ہر ترقی پسند نقاد ضرور ہوتا ہے، شاعر۔ افسانہ نگار مضمون نگار۔ ڈرامہ نگار۔ ناول نگار۔ تنقید نگار ہر ایک دوسرے پر تنقید لکھتا ہے اور اس کو اپنے فن میں یکتائے زمانہ تسلیم کر کے اس کی اہم خصوصیات کا انکشاف کرتا جاتا ہے۔

ہمارے ترقی پسند نقاد تنقید میں کامل غیر جانب داری کے تو قایل ہیں مگر یہ غیر جانب داری اپنی جماعت پر صرف نہیں کی جاتی۔ اسی لئے ہر وہ چیز جو اشتراکیت سے تعلق رکھتی ہے ہر طرح تعریف کی مستحق ہے ——— لیکن ہر وہ چیز جو شہنشاہیت سے تعلق رکھتی ہو خواہ ممتاج محل، ملٹن یا فردوسی ہی کیوں نہ ہو ہر طرح مذمت کے قابل ہے۔ اصل میں ترقی پسندوں کا مقصود ادب کو ترقی دینا نہیں ہے بلکہ ترقی پسندی کو اور اس میں وہ ہر طرح کامیاب ہیں۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

رعایتی اعلان

شہدانیات	مکتوبات سوم	مالہ و ماعلیہ	گوہر	مذہب	مختارات نیاز
چار روپیہ	چار روپیہ	دو روپیہ	ایک روپیہ	ایک روپیہ	تین روپیہ آٹھ آنہ

ان کتابوں کی قیمت علاوہ محصول پندرہ روپیہ آٹھ آنہ ہوتی ہے لیکن اگر آپ سب ایک ساتھ طلب فرمائیں گے تو معہ محصول صرف بارہ روپیہ لئے جائیں گے۔
منیجر نگار لکھنؤ

نیند

"آجاری نندیا تو آجا ذرا ..... ننھے کو میرے سلا جا ذرا ....." بھابی جان ننھے جاوید کو تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کر رہی تھیں - ان کی آواز دیوار کو چیرتی ہوئی مجھ تک پہونچی اور میرے شکستہ دل کے پردوں سے ٹکرانے لگی - کتنی مٹھاس تھی ان کی آواز میں ـــــ کتنا پیار ـــــ ؟ مجھے ان کی محبت میں ڈوبی ہوئی لو - ہی نہایت شیریں معلوم ہو رہی تھی - یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے لوری جاوید کو نہیں مجھے سلانے کے لئے گائی جا رہی ہو ـــ مجھ پر ایک محویت کا عالم طاری تھا - بھابی کی نغمہ بار آواز سے مسحور ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر میں عجیب لطف انگیز بے خودی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی - یکایک کسی تلخ یاد نے آکر میرے ذہن سے سارے انبساط افزا خیالات کو نچوڑنا شروع کیا - میں بھابی کی آواز سننا نہ چاہتی تھی کیونکہ یہ بھی محبت کی آواز تھی - آہ محبت! مجھے اس لفظ محبت سے نفرت تھی - یہ فریاد اور دھوکہ کا دوسرا نام ہے - میں نے اپنا منھ دوسری جانب پھیر لیا اور کان پر تکیہ دھر لیا - مگر میں اپنی کوشش میں ناکام رہی - بھابی کی مترنم دھیمی آواز اب بھی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی ـ نہ جانے کیوں ـ ؟ اس میں عجیب قسم کی کشش تھی ـ ایک روحانی کیف تھا میں بیتاب ہو گئی - ماضی کی یاد آنسو بن بن کر میرے پیلے رخسار پر بہنے لگی - یہ محبت بھوری جیسی محبت نہ تھی - پھولوں کی شگفتگی کو پامال کر دینے والی ہوسناک محبت! نہیں یہ تھی بچوں کے دل سے کثافت دور کر دینے والی ماں کی شبنم جیسی پاکیزہ چاہ ـ یہ وہ پاک جذبہ تھا جس کے تقدس کے آگے فرشتے جھکتے ہیں - اف ماں کی مقدس ہستی - سراپا نور - مکمل رحمت ـ !

اس کے پرخلوص الفاظ مرہم سے زیادہ سکون بخش، اس کی آغوش پناہ گاہوں سے زیادہ محفوظ، اس کے دل کی ممتا بھری دھڑکنیں نغموں سے بڑھ کر سرور افزا ـ اس کی محبت چاندنی سے لطیف تر - اس کی ہستی ملائک سے زیادہ معصوم اور اس کا مقام دیوتاؤں سے بلند تر ہے ـ !! یکایک میں اُٹھ بیٹھی - جوش عقیدت نے میری ناتوانی کو شکست دیدی ـ میرا جی چاہ رہا تھا کہ آسمان کی بلندیوں پہ پرواز کرنے لگوں - اودے اودے بادلوں میں، گلہائے بہشت کی عشرت زا نکہت میں، چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی ضیا میں، فردوس کی عطر بیز فرحت بخش ہوا میں - ستاروں کے ننھے ننھے دھڑکتے ہوئے دلوں میں - غرض ہر جگہ اپنی ماں کو تلاش کرتی پھروں ـ اور جب وہ مل جائے تو بے اختیار اس کے قدموں پر جھک جاؤں - اس کے پاؤں اپنے آنسوؤں سے بھگو دوں - اور کہوں ـ "ماں مجھے اپنی گود میں پناہ دے ـ مجھے نیند نہیں آتی ماں مجھے نیند لا دے ـــــ لوری گا کر سلا دے ـ" میں اتنا ہی سوچ پائی تھی کہ میری نگاہ اپنی کمزور بازوؤں پر پڑی ـــــ ایک سرد آہ کے ساتھ میں اپنے بستر پہ گر پڑی -

آج میرا دل بُری طرح تڑپ رہا تھا - چاند کی سیمیں ضیا میں میرے آنسو جھلملا رہے تھے - شاید یہ روپہلی کرنیں مجھے تسلی

دینے آئی تھیں مگر مجھے ان کی ضرورت نہ تھی - میرے آنسو تو میری ماں کے دامن شفقت کے منتظر تھے - کاش میری ماں اس وقت میرے پاس موجود ہوتی - یقیناً وہ مجھے سکون بخشنے میں کامیاب ہوتی - وہ اپنی آنکھوں کی نیند میری بے خواب آنکھوں میں ڈال کر میری مچلتی ہوئی حسرتوں کو تھپک تھپک کر سُلا دیتی — !

میں سوچنے لگی — آج دُنیا پکار پکار کر کہہ رہی ہے "جاگو" - "جاگو" ہر زبان پر بیداری کا کلمہ ہے - شعرا اپنے ولولہ انگیز نغموں سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر لوگوں کے خوابیدہ جذبات اور سوئے ہوئے دلوں کو بیدار کرنا چاہتے ہیں - مگر میں اس کے برعکس چاہتی ہوں کہ اپنے جاگتے ہوئے مضطرب احساسات کو لوریاں گا کر سلا دوں - کتنا فرق ہے ہمارے خیالات میں - مگر شاید نہیں — فرق صرف یہ ہے کہ ابھی انھوں نے وہ منازل طے نہیں کئے جن سے میں بہت دن ہوئے گزر چکی ہوں - ابھی ابھی ان کی بیداری کی صبح ہوئی ہے - چنانچہ وہ سمجھتے ہیں کہ آفتاب کی تیز روشنی کی مدد سے وہ دنیا کی حسین چیزوں کو دیکھ سکیں گے - یہاں کی ہر شے دلاویز ہوگی - — اور خوشنما — مگر افسوس یہ صرف خیال ہے - ہاں خیال اور وہ بھی محض خام — !! تجربہ بہت جلد ثابت کر دے گا کہ آفتاب کا مقصد حسن کو چمکانا نہیں بلکہ دنیا کی تاریکیوں پر "روشنی ڈالنا" ہے - شام ہوتے ہوتے میری طرح یہ لوگ بھی تھک جائیں گے - اور اس وقت ان کو تلاش ہوگی — نیند کی — وہ چاہیں گے کہ نیند انھیں اپنے تتلی جیسے نازک پروں پر بٹھا کر سکون کی اس دُنیا میں اُڑا لے جائے جہاں خواب کی قندیلیں جگمگاتی ہیں - اس دُنیا میں جہاں خلش نہیں، تڑپ نہیں، جلن نہیں، جہاں خموشی ہے، سکون ہے - ٹھنڈک ہے — !

اُف - آج میں کس قدر بے چین ہوں - سارا بدن چور چور ہو رہا ہے - آنکھیں سوزش غم سے جل رہی ہیں - نس نس میں ٹیس اور تپک ہے - کنپٹیاں اس بری طرح دُکھ رہی ہیں جیسے ان میں کوئی کیلیں ٹھونک رہا ہے — تپ الم سے روح مرجھا چکی ہے - پسلیاں درد کے بوجھ سے ٹوٹی جا رہی ہیں - دل تیزی سے دھڑک رہا ہے - اتنی تیزی سے گویا وہ آج ہی اپنی دھڑکنوں کا ذخیرہ ختم کر دینے والا ہے - آہ، سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں — دُکھ کے احساس نے زندگی کو وبال بنا دیا ہے - پہلے ہجوم تفکرات سے گھبرا کر چلا اُٹھتی تھی ؎

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا　　دل بھی یارب کئی دئے ہوتے

لیکن اب حسرت ہے کہ کاش مجھے دل ملتا ہی نہیں - پہلے میرا خیال تھا دل بنا ہے دُکھ سہنے کو مگر اب سمجھ میں آگیا یہ میری غلطی تھی - زبردست غلطی — دل دکھ درد برداشت کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ اس کے احساس سے تڑپنے کے لئے بنا ہے - کاش میری بچھلی دکھا کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتی - دُکھ سے زیادہ دُکھ کا احساس تکلیف دہ ہے - یہ میں اب سمجھی - اب، جبکہ میں سراپا دل بن چکی ہوں - ہر ہر عضو میں دل کی مانند تڑپ خلش اور جلن ہے — اُف کس قدر تلخ ہے یہ احساس — ! — زندگی کا احساس پارہ کی طرح تڑپ اور شمع سا سوز و گداز پیدا کر دینے والا احساس — !! میں چاہتی ہوں زندگی کو بھلا دوں - اس کی تلخیوں اور تلخ کامیوں کو بھلا دوں - ہر احساس کو فراموش کر دوں - مجھے سکون چاہئے — سکون ! لیکن افسوس مجھے یہ نہیں مل سکتا —

جب انسان ایک تڑپتے ہوئے دل کے احساس سے پریشان ہو جاتا ہے تو پھر میں جس کا ہر ہر رواں دل بن چکا ہو کیونکر قرار پا سکتی ہوں؟ اے میرے اللہ میں کیا کروں؟ کاش مجھے نیند آجاتی تو شاید کچھ دیر کے لئے آرام ہو جاتا۔

مدتوں سے میری صحت خراب ہے۔ معالج اور احباب متفکر ہیں۔ اس لئے خوف ہے کہ کہیں میں مر نہ جاؤں۔ روز بروز میری میز پر چھوٹی بڑی شیشیوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ سفید، گلابی، کاسنی ـــ! میں اکثر تنہائی میں ان سے بات کرتی ہوں۔ خوابگاہ کی نیلگوں روشنی میں چپ چاپ کھڑی کتنی اچھی لگتی ہیں یہ۔ ننھی ننھی۔ پیاری پیاری۔ شاید یہ بھی میری زندگی کے متعلق کچھ سوچا کرتی ہیں۔ یا ممکن ہے انھیں اپنی ناکامی کا ملال ہو۔ بہرکیف انھیں دیکھ کر میں خوش ہوتی ہوں ـــ بیحد خوش ـــ ان کی ناکامیوں ہی میں تو میری مسرت کا راز ہے۔ سچ مچ کتنی عجیب ہے یہ دنیا اور کس قدر تلخ ہیں اس کے حقایق۔ ایک کے آنسو میں دوسرے کا تبسم نہاں ہوتا ہے۔ کتنی بھیانک مگر سچی بات ہے یہ ـــ!!

میں سوچ رہی تھی۔ سوچتی چلی جا رہی تھی۔ اب چار سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ موت کی سی خموشی۔ ایک پژمردہ تبسم میرے لبوں پر پھیل گیا۔ میں موت سے کس قدر قریب تھی۔ اس خیال سے روح پر ایک سرور سا چھا گیا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے نیند آرہی تھی۔ یکایک بغل کے کمرے سے جاوید کے رونے کی آواز نے مجھے آکر چونکا دیا۔ اس ننھی سی جان کی چیخ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اس کی پکار میں ایک پیام تھا۔ میں سوچنے لگی۔ واقعی ع "مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قید حیات؟"

نہیں، کبھی نہیں ـــ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زندگی مجھے خون آشام نگاہوں سے گھور گھور کر دیکھ رہی ہے ـــ اس کی گرفت سے نکل کر دور ـــ بہت دور ـــ!

دوسرے کمرے سے بھابی کی آواز آرہی تھی ـــــ "آجا ری نندیا تو آجا ـــــ"

"ہاں آجا" ـــ میری زبان سے بھی بے اختیار نکل گیا۔ زندگی نے مجھے تھکا دیا تھا۔ مجھے آرام کی ضرورت تھی میں سو جانا چاہتی تھی۔ کاش مجھے نیند آجاتی ـــــ ابدی نیند ـــ!!!

نسیم نعمانی

جھوٹا استعمار دنیا حرام ہے جس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، لانا نہ لانا آپ کا فعل ہے۔
معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں، اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں۔ اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پانچ چھ انڈے ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ کہیں کی ناکامی بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مشق آبجیات کے تصور فرمائیے اسکے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک ہفتہ کے بعد پھر وزن کیجئے خود آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی۔ اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی۔ یہ دوا رخسار رونق کو مثل گلاب کے پھول کے تازہ اور شگفتہ کنول کے درخشاں بنا دے گی زیادہ کیا لکھیں ہمارا دعویٰ ہے بلکہ ہزاروں مایوس الملاج اس کے استعمال سے بامراد بن کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کوئی صاحب بیچارگی نہیں کر سکتے۔ الفقہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آسکتی۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دماغ دنیا میں نہیں ہے۔ قیمت فی شیشی چار روپیہ (للعہ) (ڈاک خرچ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دوا خانہ مفت منگائیے۔ ہیں، طوکر حاضر ہیں ناظرین کا لکھنا ہمارا کہ یہ دوا کر سکا کام کرتی ہے۔ میعاد ۳۰ سال شہرت بے نظیر فرمائیے۔
یتیم حکیم ثابت علی پیچ زرباب خوش کلام
(عالم شہری مولانائے روم صاحب)
محمود نگر ریاست لکھنؤ - یو - پی

خانِ خاناں اور اسکی مدح

عبدالرحیم خان خاناں ابن بیرم خان خاناں جیسے جامع صفات انسان کم پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے عہد کا ایک ہی شخص تھا جو تلوار اور قلم دونوں کا دھنی تھا۔ اکبری عہد کی اکثر فتوحات خان موصوف ہی کی فوجی قابلیت کی رہین منت ہیں۔ گجرات کی فتح جس میں اس نے دس ہزار کی فوج سے چالیس ہزار کی جمعیت کو شکست دی' اس کی شجاعت کا مشہور کارنامہ ہے اور سندھ و دکن کی مہموں میں اس نے اپنی تلوار سے برسوں کے اُلجھے ہوئے معاملات منٹوں میں سلجھائے۔

دوسری طرف اس کی فضیلت علمی کا یہ عالم تھا کہ ترکی و فارسی کی طرح عربی بھی گویا اس کے گھر کی زبان تھی۔ اس کے فارسی رقعے اس بات کے بیّن ثبوت ہیں کہ وہ فارسی کا بے بدل انشا تھا۔ اس نے تزک بابری کا ترجمہ نہایت سلیس اور عام فہم فارسی میں کیا۔ سنسکرت کا بھی ماہر تھا اور ہندی زبان تو ہندوستان میں رائج ہی تھی اس میں کمال کیوں نہ حاصل ہوتا۔

خان خاناں کی زندگی کا بیشتر حصہ اگرچہ رزم گاہ ہی میں گزرا۔ لیکن حیرت ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کا سخن سنج تھا۔ اس کو اتنا موقع نہیں ملا کہ کوئی ضخیم دیوان چھوڑ جاتا۔ تاہم ہفت اقلیم۔ تذکرۂ سرخوش اور تزک جہانگیری میں اس کے جستہ جستہ اشعار کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس کے کلام میں بلا کی صفائی و دل آویزی تھی۔

سعدی کی ایک مشہور غزل ہے جس پر تمام شعرائے زور آزمائی کی ہے۔ نظیری اور ظہوری کی بھی اسی طرح میں غزلیں موجود ہیں خان خاناں کی غزل بھی اسی زمین میں ہے۔ ذیل میں نظیری، خان خاناں اور سعدی کی غزلیں بالمقابل درج کی جاتی ہیں:۔

سعدی:۔

شبِ فراق کہ داند کہ تا سحر چند است — مگر کسے کہ بزندان عشق در بند است
بگفتم از غمِ دل راہ بوستاں گیرم — کدام سرو ببالائے دوست مانند است
پیام من کہ رساند بہ یار عہدِ گسل، — کہ بر شکستی و ما را ہنوز پیوند است
قسم بجان تو گفتن طریق عزت نیست — بخاک پائے تو کانہم عظیم سوگند است
ز دست رفتہ نہ تنہا نیم دریں سودا، — کہ دستہا کہ ز دستِ تو بر خداوند است
فراقِ یار کہ پیشِ تو برگ کاہے نیست — بیا و بر دل ما بین کہ کوہ الوند است

ز ضعف طاقت آہم نماند و ترسم خلق
گماں برند کہ سعدی ز دوست خرسند است

خان خاناں

شمار شوق نہ دانستہ ام کہ تا چند است
جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومند است
بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیکار ست
نگاہ اہل محبت تمام سوگند است
نہ دام دانم و نہ دانہ ایں قدر دانم
کہ پائے تا بسرش ہر چہ ہست در بند است
مرا فروخت محبت ولے نہ دانستم
کہ مشتری چہ کس است و بہائے من چند است
ادائے حق محبت عنایتے ست زدوست
وگرنہ خاطر عاشق بہ ہیچ خرسند است
بدولتے کہ بجز دوستی نہ می دانم
خدائے داند و آں کو مرا خداوند است
ازاں خوشم بہ سخنہائے دلکش تو رحیم
کہ اندکے بہ ادا ہائے عشق مانند است

نظیری

بحرف اہل غرض قرب و بعد ما بند است
دل شکستہ مارا ہزار پیوند است
ازاں دمم کہ بحسرت فگندہ دیدن او
نگہ بہ گوشۂ چشمم ہنوز در بند ست
نظر دلیر نہ شد تا مژہ بہ پیش آمد
حجاب گر پر کاہ است کوہ الوند است
دو چشم ساکن بیت الحزن بمن گردید
کہ من اسیر بہ معشوقم او بہ فرزند است
دراز دستی حسن کہ گل بہ جیب ریخت
کہ تا بہ دامنم از جیب در شکر خند است
بہ کینہ جوئی افلاک عشق می بازم
کہ ہر کہ دشمن ما شد بہ دوست مانند است
نظیری از تو بجاں کندن است لب بکشائے
بایں قدر کہ بگوئی بمیر خرسند است

صاحب ذوق سمجھ سکتا ہے کہ خان خاناں کے کلام میں جو صفائی، شگفتگی، دل آویزی اور سوز و گداز ہے، نظیری کی غزل اس سے عاری ہے۔ یہ غزل سعدی کی غزل کے ہم پایہ ہے اور ظہوری کی غزل سے بہت بلند ہے۔

سنسکرت میں اس کو کافی دست گاہ حاصل تھی چنانچہ جوتش میں ایک مثنوی لکھی جس کا ایک مصرعہ فارسی کا اور دوسرا سنسکرت کا ہے اس مثنوی کی ادبی حیثیت معلوم نہیں لیکن اتنا مسلم ہے کہ موزونی طبع نے اس کو اس بات پر مجبور کیا کہ کچھ نہ کچھ کام اس زبان میں بھی کر جائے۔ ہندی زبان کا ایسا زبردست شاعر تھا کہ ہندی شعرا کی صف اول میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے دوہے اب تک درسی کتابوں کے صفحات کی زینت ہیں۔ جو درجہ اس کو ہندی ادب میں ہے وہ اس کو فارسی ادب میں نصیب نہ ہو سکا، اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ فارسی ادب کی وسعت میں اس کا مختصر سا کلام گم ہو گیا۔ برخلاف ہندی کے کہ اس کا ادب محدود تھا اس لئے اس نے خاص شہرت حاصل کر لی۔

مگر خان خاناں نے جس وصف کی بدولت شہرت جاوید و حیات دوام حاصل کی وہ فیاضی اور علم و ادب کی قدر دانی ہے۔ اس کی قدر دانی سے جو شعرا اور اہل کمال اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے اتنے کسی سلطان کے بھی دربار میں نہ تھے۔ اس نے امیرانہ

بلیغت اور شاعرانہ مزاج پایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ہمت اور حوصلے کے جوش عطا و انعام کے لئے بہانے ڈھونڈھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعرا و اہل کمال کا ایک سیلاب امڈا اور سمٹ کر خان خاناں کے دامن میں آگیا۔ صاحب ماثر الامرا نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اس کے وقت میں اہل کمال کا وہ مجمع تھا جو سلطان حسین مرزا اور امیر علی شیر نوائی کے عہد میں پایا جاتا تھا۔

خان خاناں کی قدر دانیوں کی شہرت نہ صرف ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی تھی بلکہ وسط ایشیا اور عراق و عرب تک کے علما و فضلا اس کے دامنِ دولت میں پناہ لینے کی غرض سے سمٹ سمٹ کر چلے آرہے تھے۔ چنانچہ عبدالباقی نہاوندی مؤلف ماثر رحیمی نے خود اپنا واقعہ لکھا ہے کہ کس طرح خان مذکور کی محبت اس کے دل میں سرایت ہوئی۔ مؤلف رقم طراز ہے:

"تا آں کہ پیر و مرشد راقم اعنی جناب سید السادات، امیر منیث الدین علی محوی اسد آبادی ہمدانی کہ در ہندوستان در سلک ملازمان ایں سپہ سالار بود، بہ قصد توطن عتبات عالیات از ایشاں مرخص شدہ بہ کاشان آمد و چنداں از آثار بزرگی و احسان ذاتی و سخن سنجی و نکتہ دانی و دانش ایں دانش پژوہ و جمع از مستعدان کہ در بندگی ایشاں می بودند بیان نمود کہ ایں کمینہ و اکثرے از مستعدان ایران را غائبانہ بندہ و دعاگوئے ایشاں نمود (۱۰۰۶ ہجری) و در سنہ ہزار و ہفت غزلے در میانۂ مستعدان طرح شدہ بود۔ اگرچہ شعر و شاعری فن و روش فقیر نہ بود و مدح گفتن شعار و دثار نہ ساختہ ..... بہ گفتن ایں غزل رغبت نمود و از غایت اخلاص غائبانہ بنام نامی ایشاں مزید گردانید ——— تا بکے غلطم بخون دیدہ مژگاں نیستم تا بکے سوزم بہ حسرت داغِ حرماں نیستم"

صرف دو شعر کی غزل ہے لیکن چونکہ شعرا نے اس کو بے حد پسند کیا اس لئے میر عماد قزوینی خوش نویس سے بہ طریق قطعہ لکھوایا کہ کسی کے ہاتھ خان خاناں کی محل میں ہندوستان میں بھجوایا جائے گا۔ غور کے قابل امر یہ ہے کہ اس واقعہ کے ۱۸ سال بعد وہ خان مذکور کے دامنِ دولت میں آیا ہے۔

ایران کے مشہور شاعر مولانا محتشم کاشانی اگرچہ ہندوستان نہیں آئے لیکن خان خاناں کی قدر دانی علم و فن سے اس درجہ متاثر تھے کہ انھوں نے خواجہ محمد تاجر گیلانی کی زبان میں ایک مثنوی لکھی اور اس کو خان خاناں کے پاس بھیجا۔ یہ مثنوی درحقیقت خواجہ محمد کی سفارش میں لکھی گئی تھی جس سے ایک غلطی سرزد ہوگئی تھی۔ محتشم کی یہ مثنوی جب خان خاناں کی نظر سے گزری تو وہ اس درجہ خوش ہوا کہ خواجہ مذکور کی صرف غلطی ہی معاف نہ کی بلکہ کثیر انعام بھی مرحمت فرمایا۔

اگرچہ ماثر رحیمی میں صدہا واقعہ ایسے مذکور ہیں جن سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ خان خاناں کی قدر دانی کا چرچا گھر گھر تھا لیکن ان واقعات کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ البتہ ایک حیرت خیز واقعہ اس جگہ نقل کرنا بے موقع نہ ہوگا۔

مولانا شکیبی سفر حج سے واپسی کے وقت بندر عدن میں سیر و تفریح کی غرض سے باہر چلے گئے تھے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ لڑکوں کی ایک جماعت جنگل میں گانے میں مشغول ہے۔ اُن کے گیت کا مضمون یہ تھا کہ "خان خاناں آگیا، لڑکیوں کی شادی ہوگئی، بازار والوں نے اپنے سودے اچھی قیمت پر بیچے، ہر جگہ سے وہاں میوے آئے، بارش ہوئی، حوض پر آب ہوگئے، آدمیوں کی پریشاں حالی ختم ہوگئی"۔ مولانا مذکور پر گریہ و زاری طاری ہوگئی اور یہ رباعی حسب حال پڑھی:-

زیں دانہ کہ از نام تو کاشتہ، از اختر سعد خرمن افراشتہ
زانگونہ جہاں ہ جود اپنا شتہ کز مور کفاف دانہ برداشتہ

خان خاناں نے شعرا و علماء کی جس طرح قدر دانی کی ہے اس کی مثال تاریخ عالم میں شاید ہی ملے۔ اس کی فیاضیوں کی تفصیل سے ایک ضخیم کتاب طیار ہو سکتی ہے۔

عرفی نے جب یہ قصیدہ پیش کیا "اے داشتہ در سایہ ہم تیغ و قلم را" تو ایک لاکھ روپے دلوائے۔ ایک دوسرے قصیدہ پر بقول صاحب خزانۂ عامرہ ستر ہزار روپے انعام میں دئے۔

ایک دن نظیری نیشاپوری نے کہا کہ بندہ نے لاکھ روپیہ کا ڈھیر نہیں دیکھا۔ خان مذکور کے حکم سے خزانچی نے لاکھ روپے کی ڈھیر سامنے لگا دی اور پھر کل روپے اسی کو دلوا دئے۔

شکیبی نے جب اپنا ساقی نامہ مکمل کیا تو اسی وقت بارہ ہزار روپے اسپ عراقی اور سراپائے نامہ کے ساتھ عنایت فرمایا۔

خان خاناں کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ اس کے ساتھ صدہا بندگان خدا دسترخوان پر بیٹھتے تھے۔ اکثر کھانے کی رکابیوں میں روپے اور اشرفیاں رکھ دیتے تھے جو جس کے ہاتھ آئے اس کی قسمت۔

ایک دن کسی پیادہ کی چٹھی پر ہزار دام کی جگہ ہزار روپے لکھ دئے۔ دیوان نے عرض کیا۔ خان خاناں نے جواب دیا کہ اب جو قلم سے نکل گیا۔ اس کی قسمت!

ایک شخص خان خاناں کے پاس آیا اور یہ قطعہ لکھ کر دیا۔

اے خان جہاں خان خانان، دارم سخنے کہ رشک پروین است
گر جاں طلبد مضایقہ نیست زر می طلبد سخن دریں است

پوچھا وہ کیا مانگتے ہیں۔ کہا لاکھ روپیہ، حکم دیا سوا لاکھ دلا دو۔

ایک بھوکا برہمن خان خاناں کے دروازے پر آیا۔ دربان نے روکا۔ اس نے کہا کہدو آپ کا ہمزلف ملنے آیا ہے۔ اس کی بی بی ساتھ ہے۔ اس کو باریابی ہوئی۔ اور رشتہ کا سلسلہ کھولا اس نے کہا بیٹا اور پیتا دو بہنیں ہیں۔ پہلی میرے گھر گئی دوسری آپ کے۔ نواب بہت خوش ہوا۔ خلعت دیا اور بہت کچھ نقد و جنس دے کر رخصت کیا۔

خان خاناں کی ان شاہانہ فیاضیوں اور شاعرانہ نکتہ سنجیوں نے شعر و شاعری کے حق میں ابر کرم کا کام دیا۔ اس نے احمد آباد میں ایک بیت العلماء اور ایک عظیم الشان کتاب خانہ قایم کیا جس میں ہر فن کی نہایت نادر کتابیں تھیں۔ ایک عجیب خصوصیت اس کتاب خانہ کی یہ تھی کہ جس قدر مشہور شعرا اس کے دربار میں تھے۔ ان کے دیوان خود ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کتاب خانہ میں محفوظ تھے۔ اکثر شعرا اس کتاب خانے کی خدمت پر مامور تھے یہیں غزلوں کی طرحیں دی جاتی تھیں۔ مشاعرے ہوتے۔ خان خاناں خود بھی شریک صحبت ہوتا تھا اور قدر دانی سے دل بڑھاتا تھا۔

رسمی قلندر ایک ایرانی شاعر تھا - اس نے خان مذکور کی تربیت شعر و شعرا کا ذکر ایک قصیدے میں تفصیل سے کیا ہے چنانچہ خان خاناں کو مخاطب کر کے کہتا ہے :-

زیمن مدح تو آں نکتہ سنج شیرازی — رسید صیت کلامش بہ روم از خاور
بطرز تازہ ز مدح تو آشنا گردید — چو روے خوب کہ یابد ز ماشطہ زیور
ز فیض نام تو فیضی گرفت چوں خسرو — بہ تیغ ہندی اقلیم سبعہ را یکسر
ز ریزہ چینی خوانت نظیری شاعر — رسیدہ است بجائے کہ شاعرانِ دگر
کنند بہر مدیحش قصیدۂ انشاء — کہ خون رشک چکد از دل سخن پرور
سواد شعر شکیبی چو کحل اصفہاں — بہ تحفہ سوے خراساں برند اہلِ نظر
ز مدحت تو حیاتی حیات دیگر یافت — پئے مقوی طبع عرض بود جوہر
حدیث نوعی و کفوی بیاں چہ سازم من — چو زندہ اند بہ مدح تو تا دمِ محشر
ز نعمت تو بہ نوعی رسید آں مایہ — کہ یافت میر معزی ز نعمت سنجر
ز گلبن الش صد چمنِ گلِ امید — شگفت تا کہ بہ مدح تو شد زبان آور

خان خاناں سے متعلق ہونے والے شعرا و فضلا، صرف اتنے نہ تھے جن کا مذکور مندرجہ بالا قصیدہ میں ہوا ہے، انکی تعداد بہت زیادہ تھی چنانچہ مآثر رحیمی میں ۴۴ حکما، ۹۴ شعرا اور ۵۰ دوسرے فنون کے ماہرین کے حالات معہ ان کے مدحیہ کلام کے مندرج ہیں اور جو کتاب مذکور کے ۱۶۰۰ صفحوں پر پھیلے ہوئے ہیں - حالانکہ یہ امر مسلم ہے کہ مآثر کی فہرست بھی اس لحاظ سے نامکمل ہے کہ اس کے مؤلف نے صرف ان لوگوں کو شامل کیا ہے جن کا تعلق فارسی ادب، علم طب اور فن طب اور فن سپہ گری سے تھا، ان کے علاوہ بہت سے ہندی و سنسکرت کے ادیب، جوتش، ریاضی، فلسفہ و منطق کے ماہرین بھی خان خاناں کے دربار سے منسلک رہے ہوں گے -

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ خان خاناں کی زندگی مسلسل لڑائیوں کے سر کرنے میں گزری، لیکن اس عدیم الفرصتی کے باوجود انسنے زندگی کی دلچسپیاں کم نہ کیں - دن بھر میدان کارزار میں مصروف رہتا اور رات کو شعرا اپنے تازہ کلام سے اس کو محظوظ کرتے اور بیش قدر انعامات پاتے -

اس قدردانی کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر قسم کا بیش بہا ادب پیدا ہوا - سیکڑوں نادر و نایاب قصیدے، پر زور غزلیں، ساقی نامے، مثنویاں، رباعیاں، قطعے لکھے گئے جن سے فارسی ادب کا دامن بہت وسیع ہو گیا - عرفی کے قصیدے، نظیری کے ترکیب بند، شکیبی کی نظمیں، نوعی کا ساقی نامہ، عبدالباقی نہاوندی کے قطعات وغیرہ ایسے جواہر پارے ہیں کہ ان کی تابناکی سے چشم عالم ہمیشہ جلا پاتی رہے گی -

اگرچہ وہ کل سرمایہ جو خان خاناں کی مدح میں ہے زمانہ کی دست برد سے نہ بچ سکا کیونکہ خود صاحب مآثر (جنھوں نے صحیح البیاض کلام کے جمع کرنے میں انتہائی کوشش کی ہے، اور انھیں کی مخلصانہ سعی کا نتیجہ ہے کہ اس قدر کلام ہنوز محفوظ ہے) اس کے شاکی ہیں کہ بہت سے شعرا کا کلام باوجود تلاش کے ان کو دستیاب نہ ہو سکا۔ بہرحال جو کلام محفوظ ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے:-

قصاید ۱۲۸ - ترکیب بند ۱۱ - ترجیع بند ۶ - مثنوی ۵ - ساقی نامے ۷ - غزلیں ۵۴ - رباعیات ۸۶ - قطعات ۳۸ نثر کی تصنیف ۳ - متفرقات ۷ -

خان خاناں کے مدحیہ کلام پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کا بیشتر حصہ قصیدہ پر مشتمل ہے لیکن ان قصیدوں میں رسمی مدح وغیرہ کے علاوہ نئے نئے مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے، تنگنائے قصیدہ میں جس میں وسعت بیانی کے لئے کوئی گنجایش نہیں ہوتی، نئی نئی شاہ راہیں نکالی گئی ہیں جو شعرا کی جدت طبع کا پتہ دیتی ہیں۔

شاعری سے اگرچہ بہت سے بلند انسانی مقاصد کی تکمیل ہو سکتی ہے لیکن ایشیائی شاعروں نے اس سے چشم پوشی کی اور انکے قصیدہ مدح بیجا، غلو اور لفظی دھوم دھام کے مجموعے بن گئے لیکن خان خاناں سے متعلق قصیدوں میں ہم کو مروجہ دستور سے بغاوت نظر آتی ہے۔ وجہ غالباً صرف یہ تھی کہ خان موصوف ایک اعلیٰ درجہ کا سخن سنج تھا، وہ بھٹی اور نقالی کے مقابلہ میں شاعری کی قدر کرتا تھا اور ظاہر ہے کہ بھاٹ اور نقال کی حیثیت عرفی، نظیری، شکیبی، نوعی اور ظہوری کے مقابلہ میں کیا ہو سکتی تھی۔ عرفی، خان خاناں کی مدح میں قصیدہ لکھتا ہے لیکن اس میں اپنے ہنر کی داد چاہتا ہے:-

گہر شناس دُرِ پیش پائے بیں و بسنج — نثار من کہ بفرق تو باد ارزانی
غلط مسنج و مبیں پایمال نسیاں کن — مباد چیدہ دگر بار بر سر افشانی
سبک زجائے نہ گیری کہ بس گراں گہر است — متاع من کہ نصیبش مباد ارزانی
قماش دست زد شہرہ زمن مطلب — متاع من ہمہ دریائی است دیگر کانی
زبس کہ لعل فشاندم بنزد اہلِ قیاس، — یکے ست نسبت شیرازی و بدخشانی

اسی فخریہ جوش میں اپنا مقابلہ اساتذۂ سلف سے کرتا ہے اور اپنے کو اس سے بالاتر پاتا ہے۔ اس کو خواہ کوئی اسکی خود بینی بتائے یا خود ستائی تعبیر کرے مگر یہ حقیقت ہے کہ قصیدہ کا جو بلند معیار اس نے قایم کیا تھا وہاں تک اکثر متقدمین کا کلام نہیں پہونچتا۔

بہ عہدِ جلوۂ حسن کلام من اندوخت — قبول شاہد نظم کمال نقصانی،
کنوں کہ یافت چو من سرمہ سائے در شیراز — خرد بدیدہ کشد سرمۂ صفاہانی
ببیں کہ تافتہ ابریشمش چہ خامی یافت — زتاب اطلس من شعر بافت شروانی

مدح کے روکھے مضامین کو کس تر و تازگی سے بیان کرتا ہے۔ خان خاناں میں جو جو خوبیاں ہیں ان کو اس کامیابی سے ادا کرتا ہے کہ اصلیت کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا اور شاعری کے بھی نازک فرائض کو بھی ادا کرتا جاتا ہے:-

زفرِ عدلِ وے امروزیک بہا دارد — متاعِ نوشروانی و خانِ خاقانی
بہ عون مکرمت او نیاز کاسہ تہی — زفقر تا بہ غنا می برد بہ مہمانی
دمے کہ دست برآرد زآستیں جودش — بہ چشم آزکند موج بحرِ سوہانی
بہ عہد او شعرا در صفات زلف بتاں — کنند نقل بہ جمعیت از پریشانی
بہ وصف رایش اگر خامہ زن شوم گردد — انا ملم ہمگی چوں ہلال نورانی
ہوائے وصف کمندش بخاطرم زد موج — گرہ شد اضعی اندیشہ ام زپیچانی
دلِ حسود تو ویراں تراست ازآں موضع — کہ در زمانۂ جود تو می کند کانی
نہال بخت تو در گلشنی بود سرسبز — کہ راہ کاہ کشانش کند خیابانی
تو زیب محفل وی بیمنت کہ در میداں — سرِ زمانہ بفتراک بستہ می رانی
چو سدرہ ریشہ دوانیدہ در جہات ابد — درخت عمر تو در چار باغ ارکانی

ذرا اسی قصیدہ کی تشبیب ملاحظہ کیجئے:-

بیا کہ با دلم آں می کند پریشانی — کہ غمزۂ تو نہ کردست با مسلمانی
زدیدہ رفتی و مُردم ہماں زماں فریاد — کہ بے تو مُردم و آنگہ چنیں بہ آسانی
کسے کہ تشنہ لبِ نازتست می داند — کہ موجِ آب حیات است چین پیشانی
نہشت غمزۂ اسلام دشمنت کہ دو روز — محبت تو کنم جمع با مسلمانی،
ترحمے نہ کند حسن بر دلم گوئی — کہ در زمانۂ یوسف نبود زندانی

یہ قصیدہ حکیم ابوالفتح کی فرمائش سے لکھا گیا ہے - اس میں وہ جتنا کامیاب ہوا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ نظیری جیسا شخص اس کے مقابل میں خم ٹھونک کر آتا ہے اور پہلے اعتراض کرتا ہے لیکن آخر میں یہ شعر اسکے قلم سے ٹپک پڑتا ہے

بطرزِ وے دو سہ بیتے دگر ادا سازم — کہ بہر دعوی او قاطع است برہانی

ظہوری، حیاتی گیلانی، کامی سبزواری، تقی پیرزاد، عرشی نے بھی اسی طرح میں خان خاناں کی مدح میں زوردار قصائد لکھے ہیں، ایک ممدوح کے لئے اتنے قصاید کا ایک ہی زمین میں لکھا جانا ایسی حیرت انگیز بات ہے کہ اس کی مثال نہ مل سکے گی -

عرفی نے خان خاناں کی مدح میں ایک اور زوردار قصیدہ لکھا ہے :-

اے داشتہ در سایۂ ہم تیغ و قلم را — وے ساختہ آرایش ہم فضل و کرم را

کہتے ہیں کہ اس قصیدہ پر اس کو ایک لاکھ روپے انعام ملے تھے، اس نظم کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ شکیبی، نظیری، ملک، انیسی، تقیائے شوستری، صرفی ساوجی، بقائی نے اسی زمین میں خان خاناں کی مدح میں قصاید لکھے -

عرفی نے خان خاناں کے لڑکے کی ولادت پر جو تہنیت نامہ لکھا ہے اس میں عرفی نے اپنے زور طبع کا پورا کمال دکھایا ہے۔ تمہید کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

بود در کتم عدم بکر طبیعت راجائے — کہ خرد بر سرش استاد و ہمی گفت برائے
چند در پردہ نشیند خلف دودۂ کون — محرمش نیست مگر ہم تو شوی پردہ کشائے
مریے کن تو کہ فرزند مسیح است مسیح — عاتبے کن تو کہ اقبال گدائے ست گدائے
ایں سخن گوش زدِ بکر طبیعت چوں گست — خندہ زد گفت برو صبر کن و ژاژ مخائے
فلک آمادہ شود زہرہ مہیا گردد — آں یکے حجلہ طراز آمد و ایں غالیہ سائے
مرحبا اے گہرت را شرفِ ذاتِ پدر — مرحبا اے قدمت را اثر ظل ہمائے
مرحبا اے زعنایات ازل رمز فروش — مرحبا اے بہ علامات ہنر خویش ستائے

عرفی نے ایک قصیدہ ذوالمطلعین خان خاناں کی مدح میں لکھا ہے اس میں "فطرت انسانی" کا جس درجہ غائر مطالعہ ملتا ہے اس سے اکثر و بیشتر شعرا کا کلام عاری ہے، اس قصیدہ میں حیات انسانی کے نازک ترین مسایل پر نہایت حکیمانہ طور سے تبصرہ کیا ہے۔ تصوف اور ماورائی تصورات کا بیان انتہائی کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ کہیں کہیں "آفاقیت" کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ ذیل میں اس قصیدہ کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں :-

زخود گر دیدہ بر بندی چہ گویم کام جاں بینی — ہماں کز اشتیاق دیدنش زادی ہماں بینی
کسے کز ملکِ معنی در رسد خود را بدے بنمائے — کہ گرمس وا نمائی کیمیا را ارمغاں بینی،
زر ناقص عیارت پیش ازاں ہر کیمیائے زن — کہ ہم زر ہم محک را شرم ساز امتحاں بینی
تو سلطان غیوری در کمند نفس بد گہر — بکش زاں پیشتر خود را کہ جور از آسماں بینی

ترکِ ہوس، لذتِ غم کی تعلیم اس طرح دیتا ہے :-

زنصرت شاد شو ہر گہ غمے بر گردِ دل گردد — زغفلت داغ شو ہر گہ کہ دل را شادماں بینی
طرب را پائے بر سر زن کہ جنت را محل یابی — ہوس را دست بر دل نہ کہ دوزخ را طپاں بینی
بہ نزہت گاہِ معنی میہمانِ شو تو از استغنا — مگس را باد زن در دست براطراف خواں بینی

انسانی فطرت کی چند کمزوریاں ملاحظہ ہوں :-

چناں مشتاق خذلانی کہ با صد بند و صد زنداں — گریزی در شقاوت گر سعادت را ضماں بینی
خرد در آدمی وانگہ تو شان قدورخ سنجی — ہما در آشیاں وانگہ تو فرّ آشیاں بینی
بہ خوں آلودہ دست و تیغ غازی ماندہ بے تحسیں — تو اول زیب اسپ و زینت برگستواں بینی

بہ آب و دانہ خو کردی بلے ہنگام صیادی — جو بر صید افگنی شہباز دل را ماکیاں بینی

ذیل کے اشعار میں ایک مکمل نظام حیات کا نقشہ پیش کرکے بتایا گیا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ پر کس طرح رجعت پسندانہ عناصر اور غلط تصورات چھا گئے ہیں اور کس طرح وہ ختم کئے جا سکتے ہیں :-

نشان جاں ہمی جوئی تا نشان از بے نشاں یابی — مکانِ دل طلب کن تا مکانِ لامکاں بینی
زجو رو سدرہ ہستم بہرہ در بے دست و بے دیرہ — تو ایں دولت کجا یابی کہ جنت در مکاں بینی
زجنگ دی فرو ماندستہ ام بے منت امروز — تو ایں معنی کجا دانی کہ ہستی در زماں بینی
من از گل باغ می جویم تو گل از باغ می جوئی — من آتش از دخاں بینم تو از آتش دخاں بینی
زترتیب نظام آفرینش چوں نئی آگہ — حوادث را ز تاثیر نجوم آسماں بینی
ز ابر و آفتاب اندیشہ ات کوتہ بود زاں رو — دُر از گنجینۂ دریا و لعل از جیب کاں بینی
بہ چشم مصلحت بنگر مصاف نظم ہستی را — کہ ہر خارے دراں دادی دُرفش کاویاں بینی
شعار ملت اسلامیاں بگذار اگر خواہی — کہ دیر دیر مغاں آئی و اسرارِ نہاں بینی

معرفت کے حصول کا ذریعہ اور اس کی حقیقت یوں پیش کرتا ہے :-

گہر جوید غواصان فطرت در تہ دریا — تو در فکر ہمیں دایم کہ از دریا کراں بینی،
بہ دام اندر کشیدند اہل معنی طایر دولت — تو در زیر درختاں ہم چو طفلاں آشیاں بینی
نہ گنجد نور خورشید ازل در ظرف ہر دیدہ — بہ آب دیدۂ مرداں نگر تا عکس آں بینی
زگرد رغبت خاطر فرو شو دیدۂ فطرت — اگر خواہی کہ حسن خار و گل یک یک عیاں بینی
تو سرما دیدۂ بر شعلہ می تازی ز خاکستر — ببینی حسن خاکستر چو در روشن گراں بینی
نظر از پیشگاہ شرع در کاخ حقیقت کن — تو کز اندیشی آں بہتر کہ صد راز آستاں بینی
مرو در عرصۂ دانش کز آسیب تنک فہماں — یقیں را در پناہ پردہ داران گماں بینی
نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی — حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

اوپر کی تشریح سے یہ بات کسی قدر واضح ہو جاتی ہے کہ خان خاناں کی مدح میں جو قصاید لکھے گئے ہیں ان میں مدح کے مقابلہ میں شاعری کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس لحاظ سے ان قصاید کا مرتبہ عام قصیدوں سے بہت بلند ہے۔ (باقی)

ڈاکٹر نذیر احمد

تذکرۂ معرکۂ سخن (اب کسی قیمت پر نہیں مل سکتا) لیکن اتفاق سے اس کی چند جلدیں اسٹاک میں مل گئی ہیں۔ اس لئے جن حضرات کو ضرورت ہو فوراً اطلاع دیں۔ قیمت معہ محصول ڈاک چار روپیہ۔ مینیجر نگار لکھنؤ

رام پور کا سرکاری کتب خانہ

ریاست رام پور کا یہ کتب خانہ لال قلعہ کے اندر ٹھیک وسط شہر میں واقع ہے، ہز ہائنس نواب صاحب رام پور اسی قلعہ میں رہتے ہیں۔ قلعہ کی چہار دیواری کے اندر کتب خانہ کی عمارت "صولت منزل" ہے، یہ کتب خانہ عوام کے لئے نہیں ہے بلکہ رام پور کے نوابوں کا یہ ذاتی کتب خانہ ہے اور کتابوں کے ان ذخیروں کو انھوں نے خود ہی فراہم کیا ہے، کتب خانہ سے استفادہ کرنے والے مشاہیر میں سے زیادہ تر ریاست کے مہمان ہوتے ہیں اور اس سے آسانی کے ساتھ مستفید ہوتے ہیں، ورنہ آپ کو اجازت حاصل کرنے کے لئے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں درخواست دینا ہوگی، متعلقہ آفیسر تحقیقات کرے گا اور اگر آپ سے مطمئن ہوگا تو اجازت نامہ دیدے گا۔ آپ کو افسروں کا درباری لباس یعنی سیاہ شیروانی پگڑی اور سیاہ پمپ جوتا پہننا ہوگا تب آپ لال قلعہ میں داخل ہو سکتے ہیں اور علم و ادب مصوری اور خوشنویسی کے اس خزینۂ بے بہا سے محظوظ ہو سکتے ہیں جو ساری اسلامی دُنیا سے لاکر جمع کئے گئے ہیں۔

رام پور کا یہ کتب خانہ نواب فیاض الدین خاں کا قایم کیا ہوا ہے جو اس کے حکمران اول اور شہر رام پور کے بانی تھے، اسوقت یہ کتب خانہ توشہ خانہ کا صرف ایک حصہ تھا، جب نواب محمد سعید خاں تخت نشیں ہوئے تو انھوں نے امور سلطنت میں مختلف اصلاحات کئے اور بہت سارے نئے شعبوں کا افتتاح کیا، کتب خانہ بھی توشہ خانہ سے علٰحدہ کر دیا گیا، اور ایک الگ مگر مختصر اسٹاف مقرر کیا گیا، نواب سید محمد یوسف علی خاں (۱۸۵۵ - ۶۵ء) نے جو ایک ممتاز ادیب اور شاعر تھے لائبریری کی کتابوں اور اسٹاف (عملوں) میں کافی اضافہ کیا، کشمیری خوشنویسوں کا ایک خاندان ان کے عہد حکومت میں مدعو کیا گیا اور اس کے علاوہ بہت سے خوشنویس اور مصور خاص طور پر لائبریری کے لئے مقرر کئے گئے، لیکن وہ حکمراں جو مشرقی مخطوطات کو جمع کرنے کا بجا طور پر فخر کر سکتا ہے سید کلب علی خاں کی ذات گرامی تھی جو بڑی خوبیوں کی حامل تھی، ان کے عہد میں (۱۸۶۵ - ۱۹۰۰) ہزاروں قلمی کتابیں ہندوستان کے تمام حصوں اور چند دوسرے مسلم ممالک سے حاصل کی گئی تھیں، تقریباً مسلم تہذیب و تمدن کے ہر مرکز میں نواب کے ایجنٹ قلمی اور چھوٹی چھوٹی تصویریں خریدتے تھے اور انھیں رام پور بھیجدیتے تھے، بعض وقت انھیں صرف ایک قلمی کتاب کی بہت کافی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی، ایک بار جعفر علی خاں نسو ——— ضلع شمس آباد کے رئیس رام پور تشریف لائے اور جامع التواریخ مصنفہ رشید الدین فضل اللہ کا ایک قلمی نسخہ انھوں نے نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا، نواب صاحب نے انھیں دو ہزار روپیہ عنایت فرمایا۔ اور دو سال سے زیادہ تین سو روپیہ ماہانہ وظیفہ کے ساتھ اپنا مہمان رکھا۔ نواب صاحب نے منشی امیر احمد مینائی کو لائبریری کی فہرست مرتب کرنے کے لئے مقرر کیا۔

۱۸۸۹ء میں جب نواب سید احمد علی خاں تخت نشیں ہوئے تو قلعہ میں لائبریری کے لئے ایک نئی عمارت تعمیر کرائی گئی، اس کتب خانہ

کی نگرانی حکیم اجمل خاں صاحب دہلوی (مرحوم) کے سپرد کی گئی۔ ان کے وقت میں بڑی ترقی ہوئی، اسی وقت عربی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی فہرست کی جلد اول شایع ہوئی۔ آپ کے بعد حافظ احمد علی خاں شوق کے وقت میں کتابوں کی فہرست کی دوسری جلد چھپی۔

رام پور کے موجودہ نواب صاحب نے اپنے آبا و اجداد کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے اور اپنے طور پر بہت ساری تبدیلیاں کی ہیں۔ مسٹر امداد اللہ کاظمی امپیریل لائبریری کلکتہ کے لائبریرین موجودہ انتظام کا معائنہ کرنے کے لئے مدعو کئے گئے تھے، ۱۹۳۲ء میں مسٹر چیپ مین (امپیریل لائبریری کلکتہ کے سابق لائبریرین کا تقرر اس غرض سے عمل میں آیا تھا کہ مولانا امتیاز علی عرشی (موجودہ لائبریرین) نے فہرست مرتب کرنے کا جو کام شروع کیا تھا اس کی نگرانی کریں، قلمی کتابوں کے لئے لوہے کی الماریاں خریدی گئیں، اور جلد سازوں کا ایک بہت بڑا عملہ تمام کتابوں کی درستگی اور دوبارہ جلد سازی کے لئے بحال کیا گیا۔

نشر و اشاعت کا ایک شعبہ قایم کیا گیا جو نایاب اور قلمی کتابوں کو ترتیب دیکر شایع کرے، چار کتابیں جو قبل شایع ہو چکی ہیں، وہ یہ ہیں:۔ (۱) مکاتیب غالب، (۲) انتخاب غالب، (۳) دستور الفصاحت، (۴) کتاب الاجناس۔

اس کتب خانہ میں اس وقت کتابوں کی مجموعی تعداد اکیس ہزار آٹھ سو چھبیس ہے جس میں سے نو ہزار پانسو ترسٹھ کتابیں قلمی ہیں، السنۂ مشرقیہ کی قلمی کتابوں کی یہ سب سے زیادہ تعداد ہے جو ہندوستان کے کسی کتب خانہ میں پائی جاتی ہے۔

قلمی کتابیں عربی، فارسی، اردو، ہندی، ترکی، پشتو اور تامیل زبانوں میں ہیں، ان میں زیادہ تر نایاب اور بیش قیمت قلمی کتابیں ہیں جو ساری دنیا کے ماہرین علم کے لئے بڑی دلچسپی کا سامان ہیں، ان میں حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:۔

(۱) ایک نسخہ قرآن مجید کا ہے جو حضرت علیؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے، اس کا رسم خط کوفی ہے اور اعراب کی جگہ نقطے ہیں، ہز ہائنس نواب صاحب کے ارشاد کے مطابق خوشنویسوں کی ایک جماعت نے سر دست اس نسخہ کو آراستہ کیا ہے۔

(۲) قرآن مجید کا دوسرا نسخہ امام جعفر صادقؒ (المتوفی ۱۱۸ھ مطابق ۷۶۵ء کا نقل کیا ہوا ہے، یہ چھوٹے سیاہ کوفی رسم خط میں لکھا ہوا ہے۔ اور اس کے ابواب کی سرخیاں (عنوانات) مطلّٰی ہیں۔ پورا نسخہ نقطوں اور اعراب سے خالی ہے، قرآن حکیم کا ایک دوسرا نسخہ ابن مغلق (المتوفی ۳۲۸ھ/۹۳۹ء) خلفائے عباسیہ کے مشہور وزیر اور موجودہ عربی رسم الخط کے موجد کے نقل کردہ نسخہ سے قدیم ہے۔

(۳) عربی زبان میں تفسیر کا ایک بے مثل نسخہ مشہور صوفی عالم سفیان السواری (المتوفی ۱۶۱ھ) کی تصنیف سے ہے، یہ نسخہ تیرھویں صدی کا معلوم ہوتا ہے اس بیش بہا جواہر کا دوسرا نسخہ دنیا کے کسی حصہ میں موجود نہیں ہے۔

(۴) ہندوستان کے اول مغل شہنشاہ (بابر) کی ترکی نظموں کے مجموعہ کا ایک بے مثل نسخہ ہے جو اسی کے لئے ۶۳۵ھ/۲۸-۱۵۲۷ء میں نقل کیا گیا تھا۔ آخر میں ایک رُباعی چند اصلاحوں کے ساتھ حاشیہ پر خود شہنشاہ بابر کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ہے، آخری صفحہ کے حاشیہ پر ایک نوٹ ہے اور یہ شہنشاہ شاہ جہاں کی اپنی تحریر میں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ رباعی کے بعد شہنشاہ بابر کا دستخط تھا، بدقسمتی سے آخری رباعی سے دستخط محو ہو گیا ہے۔ اس نسخہ کے سرورق پر بیرم خاں (خان خاناں) کا دستخط ہے۔

(۵) خط نستعلیق کے ایک مشہور اُستاد میر علی الکاتب کا نقل کیا ہوا اخلاقیات پر ایک رسالہ ہے جس میں جہانگیر اور شاہ جہاں کے

دست خاص کی تحریروں کے علاوہ شاہجہاں کی بڑی لڑکی جہاں آرا بیگم کے ہاتھ کا بھی ایک نوٹ ہے۔

(۶) حافظ شیراز کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ ہے جو شہنشاہ اکبر کے لئے اور گمان غالب یہ ہے کہ اسی کے حکم سے تیار کیا گیا تھا۔ حاشیہ مطلّی ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی تصویریں دربار کے مشہور مصور کی قلمکاری کی شاہکار ہیں۔ اور تصویروں کے علاوہ ایک ایسی تصویر بھی ہے جس میں اکبر تخت پر بیٹھا ہوا ہے اور تین ماہرین علم اپنے ہاتھوں میں کتاب لئے ہوئے اس کے حضور میں کھڑے ہیں، ان میں سے دو تصویریں آپس میں اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ انسان غور کرنے کے بعد یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ فیضی اور ابوالفضل دونوں بھائی ہیں۔

(۷) مولانا رومی کی مثنوی کا ایک نسخہ ہے جسے عہد عالمگیر کے ایک عالم عبداللطیف عباسی نے مرتب کیا ہے۔ اس کے دیباچہ میں لکھا ہوا ہے کہ مرتب نے اس نسخہ کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں اسّی قلمی نسخوں سے جو ایرانی کاتبوں کے لکھے ہوئے تھے مدد لی ہے۔ یہ کشمیری کاغذ پر نہایت عمدہ ہندوستانی نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے۔

(۸) حزیں اصفہانی کے دیوان کا ایک نسخہ ہے جسے اس کے شاگرد نے اچھے کشمیری کاغذ پر بہت عمدہ فارسی خط شفیعہ میں نقل کیا ہے اس کا دیباچہ خود حزیں نے اپنی تحریر میں لکھا ہے۔ اور وہ ساری نظمیں جنھیں شاعر نے دیوان کی تدوین کے بعد لکھا تھا، کتاب کے حاشیہ پر اپنے قلم سے لکھدی ہیں۔

(۹) شہنشاہ ہمایوں کے بھائی کامران کے دیوان کا ایک نسخہ ہے جو بابر کے لڑکوں میں سب سے اچھا شاعر تھا، اس کے دیوان کا یہ دوسرا نسخہ ہے ——— بانکی پور (پٹنہ) کے کتب خانہ میں اس کا جو نسخہ ہے اس میں وہ چند شعر نہیں ہیں جو رام پور کے نسخہ میں ہیں۔

چھوٹی چھوٹی تصویروں کے ایک بڑے مجموعہ میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:-

(۱) ایک تصویر میں شہنشاہ جہانگیر تخت پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ اور درباریوں کا ایک گروہ اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے، جہانگیر ایک جام لئے ہوئے ہے جسے شہریار نے نوروز ہی اس کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کیا ہے۔ اس تصویر میں یہ خصوصیت ہے کہ اس میں تقریباً دربار کی ساری قابل قدر شخصیتوں کے نام نہایت باریک خط میں لکھے ہوئے ہیں۔

(۲) ایک اور تصویر ہے جس میں جہانگیر گھوڑے کی پشت پر سوار ہے اور سانپ اور مکڑے میں حیات و موت کی جنگ دیکھ رہا ہے اس کی توزک کے مطابق یہ حادثہ ۱۶۰۵ء میں اس کے کابل سے ہندوستان کے سفر کے دوران میں ایک پہاڑی مقام پر وقوع پذیر ہوا تھا۔

(۳) اورنگ زیب کے محاصرۂ گولکنڈہ کی ایک تصویر ہے جس میں بہت سے افراد شہنشاہ کے سامنے اپنی اپنی کلائیوں پر ریشمی فیتہ باندھے ہوئے کھڑے ہیں اور شہنشاہ کے پیچھے بہت سے سرداروں کے علاوہ راجہ کرن جو ریاست بیکانیر کے موجودہ حکمراں کے اسلاف میں ہیں، کھڑے ہیں۔

(۴) ایک تصویر جس میں دکھایا گیا ہے کہ محمد شاہ (سلطان دہلی) کا جلوس چاندنی چوک سے فتحپوری مسجد کی طرف جا رہا ہے، اس

تصویر پر مصور کا ایک نوٹ ہے جس میں لکھا ہوا ہے کہ بادشاہ نے اسے ایک ہزار روپیہ انعام عطا فرمایا تھا۔

(۵) ایک دوسری تصویر میں بڑے بڑے سردار درباری پوشاک میں نقش و نگار کے ذریعہ دکھائے گئے ہیں اور محمد شاہ سلطان دہلی ان کے بیچ میں ہے۔

قلمی نسخوں کے اعتبار سے رام پور کا یہ شاہی کتب خانہ ہندوستان کا سب سے بڑا کتب خانہ ہے۔ اوز ریسرچ اسکالر کو اس عجوبۂ روزگار قلمی نسخوں سے استفادہ کرنے کا موقعہ حاصل ہو ہر سال ملک کے ہر گوشہ سے محققین اور طلبا یہاں تحقیقی و ادبی کام کے سلسلے میں آتے ہیں۔ ادبی امداد کے علاوہ ان میں سے اکثر اصحاب ریاست کے مہمان سمجھے جاتے ہیں۔ انھیں خوش آمدید کہا جاتا ہے اور ریاست کی جانب سے انھیں ہر طرح کی آسانی بہم پہونچائی جاتی ہے۔

جو لوگ کسی خاص ادبی و تحقیقی تصنیف کے سلسلے میں قلمی نسخوں کی نقل لینا چاہتے ہیں ان کے لئے کتب خانہ کی طرف سے ان نسخوں کی نقل نویسی کی اُجرت بھی ضرورت مندوں سے نہیں لی جاتی۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۲ء کے درمیان اس کتب خانہ پر جو رقم صرف کی گئی ہے اس کی مجموعی تعداد ایک لاکھ پچانوے ہزار ایک سو آٹھ (۱۰۸، ۹۵، ۱) روپیہ ہے اور یہ اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ رام پور کے موجودہ حکمراں ہز ہائنس نواب سید رضا علی خاں اپنے آبا و اجداد کی بہ نسبت کتب خانہ سے بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ (ترجمہ)

کلیم سہسرامی

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہاز ران کمپنی)

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے :-

عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے
اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶۔ بنک اسٹریٹ بمبئی

یونیورسٹی سے لوٹتے ہوئے

کدھر ہماری سب کی زندگی کدھر جا رہی ہے؟ جدھر دیکھئے انتشار - جدھر نظر دوڑائیے بے چینی - افکار میں، خیالات میں، جذبات میں، تاثرات میں نہ کوئی منزلِ متعین ہے نہ کوئی مقصد پیشِ نظر ہے - ہم ہیں کہ بس جی رہے ہیں اور جئے جا رہے ہیں - بے مقصد، بے ارادہ، بغیر سوچے سمجھے، بغیر جانے بوجھے - بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح چلے جا رہے ہیں نہیں معلوم کدھر اور نہیں معلوم کیوں - سیاسیات کی دنیا میں آیئے تو آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ لوگوں کو کس قسم کی حکومت بنانا چاہیئے، ریاست کا کون سا مفہوم صحیح ہے - صحیح نمونۂ حکومت اور فرمانروائی کیا ہے - اعتقادات کی دنیا میں آیئے تو نہ خدا کی ہستی سمجھ میں آتی ہے نہ اس کے کام سمجھ میں آتے ہیں اور نہ اُس کی ہستی سے قطعی انکار ہی کئے بن پڑتی ہے - اخلاقیات کے میدان میں قدم رکھئے تو یہی پتہ نہیں چلتا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا - نیک کیا ہے اور بد کیا؟ ایک چیز اچھی کیوں ہے اور بُری کیوں؟ کسی معمولی آدمی سے ان باتوں کا تذکرہ کیجئے تو وہ جھوٹتے ہی یہی کہے گا کہ میاں یہ سب پیٹ بھروں کی باتیں ہیں، فرصت والوں کے مشغلے ہیں، یہاں صبح سے شام تک روٹی کمانے اور تن کی فکروں کے علاوہ مہلت کہاں کہ ایسے دور از کار اندیشوں میں پڑیں - لیجئے یہ اقتصادی مسئلہ الگ ہے کہ کون سا معاشی نظام سامنے رکھا جائے کہ سب کا پیٹ بھرے اور انسان کم از کم اس دوزخ سے تو مطمئن رہ سکے - تن کی خاطر جو وہ صبح سے شام تک بیل بنا رہتا ہے کچھ تو اس کو بھی مہلت ملے کہ کسی وقت وہ اپنے کو انسان سمجھ سکے - غرضکہ تمدن کے کسی مسئلہ کو لیجئے ہر طرف اندھیرا اور تاریکی ہی نظر آتی ہے کسی طرف بھی ایسی روشنی یا کرن نظر نہیں آتی جو ذرا دور تک بھی ہمیں لیجا سکے - ہماری حالت عجب گومگو اور کشمکش کی ہے - کبھی ہم کسی فلسفی کی باتیں سامنے رکھتے ہیں کبھی کسی مہاتما کا دامن پکڑنا چاہتے ہیں - چلتے ہیں تھوڑی دور ہر ایک تیز رو کے ساتھ - لیکن نتیجہ معلوم -

خاص کر ہندوستان میں تو تمام تر ہمارا دار و مدار تقلید پر ہے - ہندوستان ہمیشہ اپنے فاتحوں کے نقشِ قدم پر سجدے کرتا رہا ہے - چنانچہ آجکل بھی ہم سب باتوں میں ہر قسم کے نظریوں میں مغرب والوں کی پیروی کر رہے ہیں - کبھی اشتراکیت کا نمونہ اپنے سامنے رکھتے ہیں - کبھی الحاد و بے دینی سے آسمانی خدا کو بھلا کر اپنے ہی کو خدا سمجھنے لگتے ہیں، کبھی انسان کو ہر انور سے زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہتے - کبھی شہوت اور بھوک کو بس لوازماتِ زندگی قرار دیتے ہیں - کبھی اچھے اور بُرے کا سرے سے امتیاز ہی اُٹھا دینا چاہتے ہیں - غرض کہ خود ہم نے اپنی سمجھ کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور مغرب کے مادی تصورِ زندگی کو اپنے لئے شمعِ ہدایت سمجھ رکھا ہے اور بھول کر بھی نہ یہ سمجھتے ہیں نہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ ؎ پیرے کہ خود گم است کرا رہبری کند

لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کریں بھی تو کیا کریں - سمجھیں بھی تو کیا - لے دے کے ہم مشرقیوں کے پاس ہمارے صحیفے ہیں جن کو ہم نے

حل مشکلات کا طلسم اور گنجینۂ علوم سمجھتے رہے ہیں اور جن کے برتے پر ہم نے علوم ظاہری سے ہمیشہ کنارہ کشی کی ہے لیکن ہمارے صحیفے رموز سربستہ ہیں انھیں کھولے کون اور سمجھے کون ؟ جتنا سمجھ میں آتا ہے اس پر بھی یقین کامل نہیں - تو پھر اب کیا جائے - یا تو اپنے صحیفوں کو صحیح طور پر سمجھیں تاکہ مغرب کو سمجھا سکیں ورنہ پھر اپنے لئے دُعائے مغفرت کریں - انا للہ و انا الیہ راجعون

افسانۂ حقیقت — آج کل حقیقت نگاری پر زور ہے لیکن حقیقت ہے کیا ؟ کسی کو نہیں معلوم - جو کچھ تم دیکھتے ہو جو کچھ تم کہتے ہو محض تمھاری نظر ہے اور تمھاری نظر کا ایک رُخ ہے اور کچھ نہیں - کیا اشتمالیت اشتراکیت یا فرائڈ کی جنسیت کے نظرئے کل حقیقت کو واضح کرتے ہیں ہرگز نہیں - اشتمالیت اور اشتراکیت سوسائٹی کی ایک ایسی تشکیل چاہتے ہیں جس میں ہر شخص کو اس کی صلاحیت کے مطابق ضروریات زندگی مل سکیں نیز اس عدم مساوات کا سدباب ہو جائے جس کی بدولت سوسائٹی کا ایک فرد عیش و عشرت سے زندگی بسر کرتا ہے اور دوسرا کھانے پینے تک کو ترستا ہے - یہ جذبہ بہت اچھا ہے اس کی نیت پر کون حرف زنی کر سکتا ہے اور اس ظلم کی جو سوسائٹی میں ہو رہا ہے کون موافقت کر سکتا ہے لیکن کیا یہ کل حقیقت ہے یا اگر اشتمالی یا اشتراکی نظام کل دنیا میں رائج ہو جائے تو پھر سوچنے اور کہنے کے لئے کچھ نہیں رہے گا یہ خیال غلط ہے یہ تو بالکل ویسی بات ہے کہ کسی بھوکے سے پوچھا جائے کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں اور وہ کہے چار روٹیاں - بھوکے شخص کو یقیناً ہر جگہ روٹیاں نظر آئیں گی اور اس کی قوت فکر و عمل ہر وقت روٹیوں کے مرکز پر گھومتی رہے گی بھوک یقیناً ہماری زندگی کا ایک ضروری جزو ہے لیکن کل نہیں - اسی طرح فرائڈ کی جنسیت کا حال ہے - قوت شہوی ضرور ہماری زندگی کا ایک لازمی جزو ہے لیکن کل نہیں - ہو سکتا ہے کہ بھوک یا شہوت کسی وقت ہمارے کل حواس پر چھا جائے لیکن وہ ہمیشہ اور ہر وقت ہمارے اعصاب اور ہوش و حواس پر طاری نہیں ہو سکتی - جب ان ضرورتوں کا تکملہ ہو جائے گا تب ہمارا شعور اور ذہن ضرورتوں کی شدت سے آزاد ہو جائے گا اور فکر و احساس عمل اور وجدان کے لئے دوسرے میدان تلاش کرے گا - ہم ہر وقت اور ہر وقت ایک ہی فکر ایک ہی اُلجھن میں نہیں رہ سکتے یہ خلاف فطرت ہے اور اگر ہم ہیں تو جنون ہو جانا لازمی ہے اور جنون زندگی کی موت ہے - زندگی کثرت ہی میں مرئی آسودہ ہوتی ہے، وحدت میں نہیں - اگر اس کی نظر کے سامنے کثرت کے تماشے نہ ہوں تو وحدت تماشا حیران ہو جائے -

آجکل ادب کی زندگی کے ہر شعبہ پر گرسنگی اور شہوت سوار ہے - مغرب میں قلت پیداوار کے باعث ماکولات اور مشروبات کی ہمیشہ ضرورت رہی اور ہر مغربی کا ذہن ہمیشہ کسب معاش اور فراہمی غذا میں گرفتار رہا - اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کا فلسفۂ حیات بھی شدت سے مادی ہو جاتا، مارکس کا فلسفہ چنانچہ اُس ذہنی مادی کشمکش کا آخری نقطۂ عروج ہے - اس طرح ان سرد ممالک اور بنجر زمینوں کے مغربیوں کے ذہن ہمیشہ وحشی رہے اور جب انھیں ذرا بھی عیش و عشرت نصیب ہوئی، شراب ناب - نغمہ و رقص - زنا اور فحاشی کے جواز پیش کر کے انجمنیں اور اصول بنا لئے گئے - عیاشی غم کو جلا دینے کا آسان ترین ذریعہ ہے - غم کو عورت اور شراب کے ذریعہ کون نہیں بھلانا چاہتا - کھچے ہوئے اعصاب، سکون اور گدازی کے لئے کب آسان سے آسان طریقہ قبول نہیں کر لینا چاہتے تقریباً ہر مجنون جنسی امراض کا شکار ہو جاتا ہے - لیکن یہ بہت سستے قسم کا گریز ہے - جان کس طرح بچائی جائے - جہاں فراہمی غذا میں جان لڑانا پڑتی ہو اور عورت و مرد دونوں کو مشترکہ اس کی فراہمی کا انتظام کرنا پڑتا ہو وہاں پردہ کا رواج کیسے ہوتا اور جب پردہ بھی حایل ہو

تو عورت کا خیال کیونکر نہ آئے۔ غرضکہ مغرب میں زمین کی ساخت اور وہاں کی آب و ہوا نے کچھ ایسی سماجی اصول بنا دئے جو صرف ایک شدت سے مادی نقطۂ نظر کے اذہان اور قلوب پیدا کر سکتے تھے جن کے بنیادی اصول پر صرف گرسنگی اور شہوت ہی غالب ہو سکتی تھی۔ چنانچہ موصوم فرائڈ بھی اسی اصول میں سے ایک تک پہونچ سکا۔ جہاں صدیوں سے عورت، مردوں کے ذہنوں پر سوار رہی ہو، وہاں کے لوگوں کے ذہنوں کا چاہے جتنا تجزیہ کیا جاتا عورت ہی نتیجہ میں نکل سکتی تھی۔ چنانچہ بیچارا فرائڈ مجبور ہوا کہ اپنے تجربات کے نتائج کو کل سمجھ کر دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھائے۔ فرائڈ بذات خود بڑا نیک اور برگزیدہ شخص تھا اپنی معصومیت کی وجہ سے اُسے مسیح کا لقب دیا جاتا تھا ایسا معصوم شخص بھی لازماً مجبور ہوا کہ وہ یہی کہے کہ زندگی کے ہر شعبہ پر جنسیت ہی حاوی ہے اور کچھ نہیں، بالکل اسی طرح جیسے اُس کا دوسرا حریف مارکس کہتا ہے کہ زندگی اور اس کی تاریخ کی تشکیل مادی ضرورتیں ہی کرتی رہی ہیں اور کچھ نہیں۔

ہندوستانی بیچارے کس شمار میں۔ ان کے ذہن برسوں کے غلام۔ تجربات کے لئے ان کے پاس سامان کہاں اور نہ ان کے پاس فرصت کہ علمی تحقیقات میں پڑ سکیں، کسب معاش نے شوق کا گلا ہی گھونٹ دیا اگر کسی میں شوق پیدا بھی ہوا۔ چنانچہ شور کے ساتھ انکا ذہن بھی مغرب کا غلام ہو گیا اور یہ بھی وہیں کے تال پر رقص کرنے لگے اور خوب خوب رقص کر رہے ہیں۔

ہاں تو آج ہمارے ادبیات پر مزدور۔ کسان۔ غربت اور عورت سوار ہے۔ لیکن غور تو کیجئے کیا زندگی کی کائنات انھیں غریبوں کی تصحیح یا صرف انھیں امراض کے ازالہ پر موقوف ہے۔ پیاسے آدمی کو ہر جگہ پانی نظر آئے گا اور وہ ہر وقت پانی مانگے گا اور اُس کی زندگی کا مقصد ہی پیاس کی تسکین نظر آئے گا لیکن اگر کسی طرح اُسے پانی پلا دیا جائے یا اتفاق سے اُسے پانی ملجائے تو کیا وہ پیاس کی تسکین کے بعد اپنی زندگی ختم سمجھے گا یا اُسے ختم کر دے گا ہرگز نہیں البتہ اس کا احتمال ضروری ہے کہ کہیں وہ اتنا پانی نہ پی جائے کہ واقعی پانی ہی اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ غذا ہمارے ہوش و حواس اور جسم کو برقرار رکھنے کے لئے یقینی ایک نہایت ہی ضروری چیز ہے۔ اس کے بغیر کے یقینی ہم زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتے نہ ہمارے ہوش و حواس زیادہ عرصہ تک برقرار رہ سکتے ہیں لیکن بھوک کا درجہ اتنا بھی بلند نہیں کہ ہمیں اپنی زندگی کی کل تاریخ ہی بھوک کو تقدیر سے تسکین دینے کا ایک عمل مسلسل نظر آنے لگے۔ اسی طرح عورت مردوں کے لئے اور مرد عورتوں کے لئے ضرور سامان حظ ہیں ایسا سامان جن کے بغیر ایک دوسرے کی زندگی سنسان ہو جائے اور زندگی میں کوئی لطف نہ رہے اور جب زندگی میں کوئی لطف نہ رہے تو ایسی زندگی ہی کون بسر کرنا چاہیگا۔ آدم حوا کے بغیر اور حوا آدم کے بغیر اس دنیا میں کیونکر جی سکتے تھے ایک دوسرے کے دل بہلانے کے لئے ایک کیلئے دوسرے کا ہونا یقینی اشد ضروری ہے لیکن یہ دلچسپی بھی ہماری زندگی کا ایک جزو ہے اور بہت اہم جزو لیکن کُل نہیں۔ اور اگر اسے بھی کُل سمجھا گیا تو اس میں بھی زندگی کی فنا لازمی ہے بالکل اُسی طرح جیسے کسی پیاسے کو پانی ملجائے اور وہ پیتا ہی چلا جائے۔ موجودہ معیارات نظر یقیناً وقتی ہیں اور کل یہی حقیقتیں نرور افسانہ ہو جائیں گی۔

یقینی دُنیا آج بڑے ابتلا اور مصیبت کے دور سے گزر رہی ہے۔ سامان غذا اور سامان تفریح کی کمی اور غلط تقسیم نے ذہنوں کو کچھ اس قدر مفلوج کر دیا ہے کہ اب ہم ان سے ہٹ کر کچھ سوچ بھی نہیں سکتے اور بعض لوگ تو سوچنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے۔ اور اسی اعصاب زدگی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری سیاست ہماری معیشت اور ہماری ادبیات سب انھیں دو قطبین کے درمیان محصور ہو کر رہ گئی ہیں

اور صرف یہی نہیں انھیں ضرورتوں کی خاطر جنگیں لڑی گئی ہیں اور مزید جنگوں کی طیاریاں ہیں۔ لیکن کیا یہ ہندوستان جس نے اپنے کو ہمیشہ مادیت سے بلند رکھا ہے جس نے اپنے نفس اور آتما کو قابو میں کر لینے کو ایک فن بنا لیا ہے اور کیا وہ اسلام جس نے ہر مادی ضرورت کی تسکین میں اعتدال و تیم رکھنے کو کہا ہے مادی ضرورتوں کی ان عالمگیر ذہنی اور بجلی زور آزمائیوں میں اپنے اپنے اُصول بھلا بیٹھے گا ؟ - ارباب فکر و نظر کے لئے ان سطور میں غور فکر کا سامان ہے -

شعر و ادب | ادب حقیقت کے حسین ترین اظہار کا نام ہے - شعر ادب کے اُس جزو کا نام ہے جس میں حُسن پر زیادہ زور دیا جاتا ہے بہ نسبت حقیقت کے - پیمبری ادب کا وہ جزو ہے جس میں حقیقت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے بہ نسبت حُسن کے - فلسفہ وہ جزو ہے جس میں حقیقت ہی پر زور ہوتا ہے حُسن پر نہیں - اس کی نمود وہ ادبیات ہے جسے حُسن برائے حُسن کہا جاتا ہے -

درخت کی زندگی کا مقصد پھول اور بیج پیدا کرنا ہے تاکہ اس کا سلسلۂ حیات باقی رہے - کل مخلوق کی زندگی کا مقصد اپنی ہی مخلوق کی تخلیق ہے - پھولوں کی خوشنمائی - طاؤس کا رقص - صنف نازک کی خوبصورتی سب قدرت کے وہ حسین دھوکے ہیں جن کا مقصد تخم پیدا کرنا ہے آیندہ تخلیق کے لئے - غالباً قدرت کے نزدیک کارِ خلاقی اس طمع خام کے بغیر کوئی کشش نہ رکھتا اور اس لئے تخلیق کا جذبہ یا تو حرکت میں نہ آتا یا اس قدر فراوانی کے ساتھ مقبول نہ ہوتا اس لئے مقصدِ فطرت کو صدمہ پہونچتا - تو یہ حُسن کا فریب ایک ضروری فریب ہے جس کے بغیر کسی ذی ہوش کو چارہ نہیں - آیئے اِس فریب کو ایک حقیقت مان لیں -

زنقصِ تشنہ لبی واں بہ عقلِ خویش مناز دلت فریب گر از جلوۂ سراب نہ خورد (عرفی)

یہی وجہ ہے کہ حُسن کسی نہ کسی معیار کا ہمیشہ ہماری روحوں کے ساتھ رہا ہے اس لئے اُسے ایک "نفسیاتی قید" یا جبلت مان لینا ضروری ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ اس کا تعلق جنسیات سے ضروری ہے اسکا ہمیشہ شعور رہتا ہے - استعمال اسے کسی کام پر کیا جائے یا کسی پیمانے پر کیا جائے -

پھول درخت کے نشو و نما کا وہ نقطۂ ارتقا ہیں جب پودا اپنی قوت حیات کے مد میں اُس درجہ پر پہونچ جائے کہ وہ اپنی جنس کی بقا کے لئے باکار سمجھا جائے تخم اسی شباب کا ثمر بیش رس ہے - ہر جاندار کی زندگی انھیں منازل سے طبعاً گزرتی ہے اس راستے پر رجعت ممکن نہیں -

ہمارے ادب کا بھی یہی حال ہونا چاہئے - ادب میں زندگی شرط اول ہے - اُس کا ظاہر دیدہ زیب ضرور ہو ورنہ وہ ادبیات کے قسم کی چیز نہ رہیگا - شعر ادب کا لطیف ترین جزو ہے اور اُسکا وہ نقطۂ ارتقا ہے جب ادب پختہ ہو کر بار آور ہونے کے لایق ہو جاتا ہے - اسی لئے شعر میں حُسن پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے اگر اُس پر توجہ کم دی گئی تو وہ کوئی اچھا ادبی کارنامہ نہ ہوگا - حُسن کا مقصد چونکہ اشتعال تخلیق ہے اس لئے شعر میں عشق و محبت کا افسانہ اس کا بہترین مصرف اور اُسکا بہترین فطری موضوع ہے - اور ادب کی دوسری اصناف میں زندگی اور اسکی تصویریں اور تفسیریں انکا بہترین اور فطری مصرف - اس لئے ادب برائے ادب کا نظریہ بالکل صحیح ہے - حُسن کا مقصد تخلیق کے علاوہ وہ سکون اور اطمینان بخشنا بھی جو زندگی کے قیام کے لئے ضروری ہے - مادی دُنیا کے خلفشار اور اُس کی آمیزش اور آویزش سے اعصاب، ذہن اور پھر جسم میں جو انتشار پیدا ہو جاتا ہے وہ قاطع حیات ہے - اس انتشار روحانی میں سکون پیدا کرنا حُسن ہی کا کام ہے - تھکے ہوئے مزدور میں دوبارہ محنت کی قوت کیونکر پیدا ہوتی ہے - آرام سے اور اُس تفریح سے ایک پروفیسر سے) جو اُسے مزدوری کے معاوضہ میں حاصل ہوتی ہے اس لئے آرٹ برائے آرٹ، یا آرٹ برائے تفریح وہی افادی پہلو رکھتا ہے جیسے کام کے بعد آرام، محنت کے بعد نیند - ہمیں صحیح زندگی کے لئے ادب برائے زندگی کی خاطر، ادب برائے ادب کی بھی ہمیشہ ضرورت رہے گی - ذات کو صفات کے بغیر تصور میں بھی نہیں لا سکتے -

جھگڑالو

عادت سے مجبور جھگڑالو ہی نہیں ہوتے بہت کچھ اور بھی ہوتے ہیں یہ بھی جھگڑے کی بات ہے لیکن میں بھی کیا کروں عادت سے مجبور۔ ہوں جھگڑنے کے لئے عادت کی کچھ اتنی ضرورت نہیں۔ کھانے کے لئے بھوک کی کیا ضرورت ہوئی۔ دونوں کے لئے صرف موقع کی ضرورت ہے۔ اور موقع نکال لینا کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ آدمی کی یہی تو بڑی جیت ہے کہ وہ جب چاہے جہاں چاہے موقع نکال لیتا ہے۔

بعض تو یوں جھگڑتے ہیں کہ ہاضمہ میں فتور ہو گیا ہے۔ جب غذا جزو بدن نہ ہوتی ہو تو تحمل جزو مزاج کیونکر ہو۔ بعض لوگ جھگڑتے ہی اس لئے ہیں کہ کھانا ہضم ہو۔ یہ تو نہیں معلوم کہ اس ورزش سے کھانا ہضم ہوتا ہے یا نہیں۔ البتہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ ایسے حضرات دیکھے گئے ہیں جنکے جھگڑنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ ناواقف یہ سمجھے کہ جو کچھ ہضم ہو چکا تھا وہ پھر سے ہرا ہو رہا ہے۔

بعض اس لئے جھگڑتے ہیں کہ نیت میں فتور ہوتا ہے۔ کہتے کچھ ہیں۔ کرنا کچھ اور چاہتے ہیں۔ اپنا نفع دیکھتے ہیں، دوسرے کا نقصان خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ ایک اور ایک دو کو کچھ نہ مانیں گے۔ جب تک ایک اور ایک کے معنی دو روٹی کے نہ ہوں۔ آپ کہیں گے یہ کہاوت تو بھوکے پر صادق آتی ہے جھگڑالو پر نہیں۔ میں بغیر جھگڑے کے یہ عرض کروں گا کہ بھوکے کی نیت کب بخیر ہوتی ہے؟

کچھ اس لئے جھگڑتے ہیں کہ عقل میں فتور ہوتا ہے۔ یہ بات سمجھتے نہیں مار کھانے پر طیار رہتے ہیں۔ عقل کی کمی کو جھگڑنے یا رو پڑنے سے پوری کرنا چاہتے ہیں۔ عورتیں اس فن میں طاق ہوتی ہیں اور اس میں شک نہیں ان کے یہ حربے کبھی خطا نہیں کرتے اس لئے ایسے مواقع پر مرد عقل کے ہاتھوں لاچار ہوتا ہے۔ اکثر شاعری کے ہاتھوں بھی حادثے کو دو ہی طرح سے دعوت دیجاتی ہے۔ آیت پڑھ کر یا شعر پڑھ کر۔ البتہ ہمارا آپ کا حال یہ ہے کہ ہم شعر پڑھ کر مار کھاتے ہیں اور آیت پڑھ کر صبر کر لیتے ہیں!

مجھے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد ہے، ریاضی میں صفر تھا۔ عبارتی سوال مجھے جتنا دلچسپ معلوم ہوتا تھا اتنا ہی اس کے حل کرنے میں کورا تھا چھوٹے بڑے، ہمسائے، راہ چلتے، نئے شوہر، پنشن یافتہ ماسٹر بھی اپنے اپنے طور پر حساب سمجھانے کی کوشش کرتے۔ میں ان سے جھگڑتا تھا اور خفت یا خفگی سے رونا آتا تو اس کے چھپانے کی جتنی کوشش کرتا اگر اتنی کوشش آج کروں تو مارشل بلین اور بلیک مارکیٹ یا بلیک میل (BLACKMAIL) میں آپ کوئی امتیاز نہ کر سکیں۔ مجھے یہ چیز بڑی ناگوار گزرتی تھی کہ سوال کا جواب پہلے سے کیوں فرض کر لیا جائے میرے دل میں معلوم نہیں کیوں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ فرض کیا نہیں اور مارے گئے نہیں! جہاں ایک بات مانی پھر مقالات فلاطون کے سوا چارہ نہیں! سمجھانے یا سمجھنے کے دوران میں حسب معمول میں نے کوئی اور جنل بات کہی نہیں کہ سمجھانے والا ہنسا بگڑا یا مجھ پر ترس کھانے لگا اور یہ تینوں باتیں مجھے زہر معلوم ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے میں عادت سے مجبور نہ تھا۔ لیکن جھگڑنے میں کسی سے پیچھے نہ تھا!

یہی سالی نیت کے فتور کا ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ لیڈر نہیں۔ روٹی کمائیں اور جیل نہ جائیں اور تبلیغ کرتے ہیں اس کی کہ دوسرے فاقے کریں، مار کھائیں اور جیل جائیں۔ یہ کبھی نہ چاہیں گے کہ جھگڑا ختم کیا جائے اس لئے کہ جھگڑا ختم ہوتے ہی اُن کا پرسان حال کوئی نہ ہوگا۔ افراد نے ذاتی نفع کی خاطر جماعت اور ملک کو اکثر غارت کیا ہے۔ آپ جہاں بھی دیکھیں گے بالآخر یہی معلوم ہوگا کہ کوئی ایک شخص ہے جو اپنے نفس کی خاطر معاملہ کو روبراہ نہیں ہونے دیتا۔ جو لوگ ہاضمہ کے فتور میں مبتلا ہیں اُن کو میں سب سے مخلص جھگڑنے والا سمجھتا ہوں اور انکی بڑی قدر کرتا ہوں اس لئے کہ وہ جھگڑتے ہیں محض جھگڑے کی خاطر۔ اس میں نفع نقصان، دُنیا آخرت، زید بکر، کسی کی قید نہیں۔ آرٹ برائے آرٹ۔ ہمارے لئے اب مقبول رہا ہو یا نہیں لیکن جھگڑا برائے جھگڑا کی عظمت کا میں ہمیشہ سے قایل رہا!

میرے ایک دوست ہیں، اور یقیناً آپ کا بھی کوئی دوست ایسا ہی ہوگا جو بغیر جھگڑے سلام بھی نہ کرتا ہو۔ لیکن میرے اور آپ کے دوست میں ایک نمایاں فرق ہے۔ میرے دوست کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ آپ ان سے اتفاق کریں تو یہ اور زیادہ چراغ پا ہوں گے۔ ان کا خیال ہے کہ جب اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی تو اقلیدس کی لکیر کیسے سیدھی ہو سکتی ہے۔

فرض کر لیجئے یہ کمیونسٹ ہیں اور اس مان لینے میں مضایقہ ہی کیا ہے، آخر دُنیا میں فرضی کمیونسٹ ہوتے ہی ہوں گے۔ اب اگر آپ کمیونزم کے خلاف کچھ کہیں تو سوا مار ڈالنے کے یہ آپ کے ساتھ ہر قسم کا سلوک کریں گے۔ مار ڈالنے کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف بحث کرنے کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ یہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اس لئے جھگڑا بھی ختم نہیں ہوتا۔ ان دوست کا ہاضمہ اور حافظہ دونوں عجیب و غریب ہے اور جھگڑے یہ پیدا کرتے ہیں ان دونوں کے عجیب و غریب استعمال ہی سے۔ یعنی ہاضمہ کا کام حافظہ سے لیتے ہیں اور حافظہ کا ہاضمے سے! مثلاً دعوتوں میں یہ یاد رکھتے ہیں کہ کون سی چیز گھر پر کھانے کو نہیں ملتی اور بحث میں یہ بھول جاتے ہیں کہ کہاں اتفاق ہو سکتا ہے۔

کمونزم پر یہ پختہ یقین رکھتے ہیں لیکن خود کمیونسٹوں سے ہر مسئلہ پر جھگڑتے ہیں اسی صحبت میں اگر کوئی شخص خود جھگڑنے میں ان سے متفق ہو جائے تو اس سے جھگڑنے لگیں گے۔ خدائی قانون سے اختلاف کریں گے اس لئے کہ یہ خود خدا نہیں۔ انسان کے بنائے ہوئے قوانین کی مخالفت کریں گے۔ اس لئے کہ یہ خود انسان ہیں۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے فرشتوں کو اپنی تعریف اور بڑائی کرنے کے لئے پیدا کیا۔ پھر معلوم نہیں کون سی مصلحت دیکھی کہ شیطان کو پیدا کر دیا۔ یہاں شیطان و یزداں کی بحث میں پڑنے سے نہ کوئی حاصل نہ اس کا کوئی موقعہ البتہ میرے دل میں یہ بات آتی ہے کہ فرشتہ اور شیطان دونوں کو پیدا کرنے کے بعد مشیت الٰہی نے کوئی کمی کہیں ضرور دیکھی اور ہمارے دوست کو پیدا کر دیا۔ عالم طبعی کا نظام مثبت و منفی قوتوں کی ہمہ گیر و ہمہ وقت کشاکش سے قایم رہتا ہے۔ ان میں توازن قایم ہوا نہیں اور عالم کا شیرازہ بکھرا نہیں۔ دونوں قوتیں کبھی بھی آپس میں ساز باز کر کے دُنیا کا سارا کھیل بگاڑ سکتی تھیں۔ اس خطرے کی روک تھام کے لئے ہمارے دوست وجود میں آگئے۔ یہ نہ مثبت ہیں نہ منفی بلکہ دونوں کے لئے خطرہ اور خطرہ بھی ایسا جس سے بڑا کوئی دوسرا خطرہ ہو نہیں سکتا یعنی نوئیسنس!۔۔۔ شعر و ادب کے بھی جھگڑالو ہوتے ہیں۔ آپ نے انیس کا مشہور شعر سُنا ہوگا:-

غلط یہ لفظ و مضموں خلاف، بندش سست ہنر عجیب بلا ہے یہ عجیب چینوں کو

ہمارے دوست کو بہترین شعرا کے بہترین کلام میں بھی نقص نظر آجاتا ہے۔ مثلاً الف گرتا ہے، ی دبتی ہے۔ یہاں الف جلی ہے وہاں خفی۔ شتر گربگی ہے۔ وہ کتا خصی۔ ان کا زمانہ خود ان سے اور یہ خود زمانہ سے اُکتا کر ختم ہو گئے لیکن اس طرح کے جھگڑے اور جھگڑالو اب بھی موجود ہیں۔ چنانچہ صورت حال یہ ہے کہ نظم ہو یا نثر، افسانہ ہو یا تنقید، جھگڑے چلے ہی جاتے ہیں۔ اب جھگڑا اس پر ہے کہ آرٹ برائے آرٹ ہے یا برائے زندگی۔ پہلے الف کا گرنا اور ی کا دبنا یا خفی و جلی کا جھگڑا تھا۔ اب اس کا کہ بورژوا ہے یا پرولتاری، جنسیت ہے یا فرایت لاشعور ہے یا تحت شعور، روحانیت ہے یا حقیقت، انقلاب ہے یا التماس۔ خون ہے یا صفر!!

اِس دنیا میں جھگڑنے سے زیادہ آسان مشغلہ ہمارے آپ کے لئے شاید ہی کوئی اور ہو اور اس فن میں عورتوں اور اڈیٹروں سے شاید ہی کوئی اور بازی لے گیا ہو۔ اس بنا پر عورتوں سے گھر کے اندر اور اڈیٹروں سے گھر کے باہر کی دُنیا نورٌ علیٰ نور ہوتی ہے یہ بتانا تو آسان ہے لیکن اس کا مان لینا مشکل کہ جنت میں شیطان نے عورت کو بہکایا یا عورت نے شیطان کو۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ مرد اور شیطان دونوں وہاں سے نکالے گئے۔ بہکانے اور جھگڑنے میں فرق ضرور ہے لیکن دراصل بہکانے اور جھگڑا کرنے میں صرف مقدم اور موخر کا فرق ہے۔ بہکانے میں جھگڑے کی نیت یقیناً پوشیدہ ہوتی ہے۔ عورت اور شیطان اس جرم میں جنت سے نکالے گئے اور اس دنیا میں آئے۔ بہت سے ایسے ہیں جو شیطان اور عورت ہی کے واسطے سے اس دُنیا کو جنت سے کچھ کم نہیں سمجھتے!

گھر میں عورت اور گھر سے باہر اڈیٹر طرح طرح سے جھگڑتے ہیں۔ عورت کروڑپتی ہی کی بیوی کیوں نہ ہو۔ اس کی شکایت کرے گی کہ اُسے پیسے میسر نہیں۔ ظاہر ہے اُس کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے لیکن وہ شوہر سے جھگڑے گی اس لئے کہ وہ دولت پیدا کرنے کے علاوہ دوسروں کو بیویوں کو کیوں نہیں مار ڈالتا۔ وہ نوکر سے اس لئے جھگڑے گی کہ نوکر تو صرف نوکر ہوتے ہیں، تنخواہ یا معاوضہ سے کیا سروکار۔ یہ کھاتے پیتے سوتے جاگتے کیوں ہیں۔ وہ دوسروں کی بیویوں سے جھگڑے گی۔ اس لئے کہ وہ جانتی ہے کہ وہ خود ان کے بارے میں جیسی رائے رکھتی ہے اُس سے کہیں زیادہ تند و تاریک رائے دوسری عورتیں اُس کے بارے میں رکھتی ہیں وہ خدا سے جھگڑا مول لے گی اس لئے خدا کا تعلق دُنیا کی عورتوں سے کیوں ہے!

اڈیٹروں کی کرامات کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک اڈیٹر صاحب نے انتقال فرمایا۔ یہاں یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ جس روایت کا میں تذکرہ کرنے والا ہوں وہ بیان کی ہوئی تو ہے ایک اڈیٹر صاحب کے ہم پیشہ کی لیکن دوسری یعنی ان کا انتقال فرمانا ایک ایسی ایجنسی سے ہے جس کا کوئی تعلق پہلی سے نہیں ہے۔ مرحوم اڈیٹر صاحب کی روح جنت کے دروازہ پر پہنچی تو داروغہ جنت نے ان کی پذیرائی کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جنت میں اڈیٹر کا کام نہیں۔ وہاں سے روح جہنم کے دروازہ پر آئی۔ مالک دوزخ نے بھی ان کو قبول کرنے سے انکار کیا کہ جہنم کسی اڈیٹر کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

اڈیٹر صاحب کی روح نے بغیر کسی تکلیف کے جنت اور دوزخ کے درمیان اپنا آفس کھول دیا! نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن ان کو دو دعوتی کارڈ وصول ہوئے۔ ایک جنت سے دوسرا جہنم سے!

دوسرا قصہ اسی دُنیا کا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک بستی میں دو اخبارات تھے ایک کا نام بجھو تھا اور دوسرے کا نام بھالا۔ تھوڑے ہی

دنوں میں بستی میں کہرام مچ گیا۔ نہ کسی کی جان کی خیر تھی نہ مال کی نہ آبرو کی۔ آخر میں ایک شریف آدمی نے بڑی جدوجہد کے بعد دونوں اخباروں کے اڈیٹروں کو مدعو کیا تاکہ وہ صلح کرلیں اور بستی کے لوگ حیات مستعار کے کچھ دن امن وعافیت سے بسر کرلیں۔

بچھو کے مدیر مسئول صاحب تشریف لائے جو ہر حیثیت سے اسم بامسمّیٰ تھے اب تلاش شروع ہوئی کہ بھالا کے سمپادک کہاں تشریف رکھتے ہیں، بڑی دیر کی جستجو اور دوڑ دھوپ کے بعد بچھو صاحب نے ظاہر فرمایا کہ موصوف ہی بھالا کے بھی اڈیٹر تھے۔

اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس سعادت مند فرقہ کے بارہ میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے!

جھگڑنا اکثر غم وغصہ یا حماقت کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ محض ایک مشغلۂ زندگی کے طور پر۔ جیسے شعر کہنا، خضاب لگانا یا افیون کھانا۔ ایک زمانہ میں میرا قیام ایک ایسے محلہ میں تھا۔ جہاں دو پڑوسیوں میں مکان کی تقسیم کا جھگڑا تھا۔ یہ جھگڑا ہر منزل سے گزر کر عدالت تک پہونچا اور مکان دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ لیکن جھگڑے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سورج ڈوبتے ہی ڈیورنڈ لائن کے اِدھر اُدھر دو بڈھے دکھائی دیتے پہلے ایک آیا۔ ایک ہاتھ میں بڑا سا رومال، دوسرے میں حُقّہ، دوسرے صاحب بھی فوراً نمودار ہوئے۔ ایک ہاتھ میں رومال دوسرے میں بٹیر۔ دونوں نے اپنے اپنے رومالوں سے بیٹھنے کی جگہ صاف کی۔ ایک نے اللہ کا نام لیا اور بیٹھ گیا۔ دوسرے نے نزلہ کو گالی دی اور بیٹھ گیا۔ ایک نے کہا آداب بجالاتا ہوں میرن صاحب، دوسرے نے کہا مجرا عرض ہے منجھو صاحب۔ اس کے بعد حجت شروع ہوئی۔ ۱۵ منٹ تک میرن صاحب بے نقط سناتے رہے اور منجھو صاحب خاموش سُنتے رہے اور حقہ پیتے رہے اس کے بعد منجھو صاحب نے حقہ میرن صاحب کے اور میرن صاحب نے بیٹر منجھو صاحب کے حوالے کی جن کو دونوں نے فرشی سلام کے ساتھ قبول کیا اور دوسرے ۱۵ منٹ تک منجھو صاحب میرن صاحب کو صلواتیں سُناتے رہے اور میرن صاحب خاموش سنتے رہے اور حقہ پیتے رہے دو گھنٹے مسلسل میر صاحبان جھگڑتے رہے اور حقہ اور بیٹر باری باری بدلتے رہے، حُقّہ جل جاتا تو نوکر دوسرا حقہ لاکر رکھ دیتا اور پہلا حُقّہ اُٹھا لیجا۔ یہ ناممکن تھا کہ جب ایک گل فشانی کر رہا ہو تو دوسرا حُقّہ چھوڑ کر جواب دے۔ یہاں تک کہ وقت ختم ہو جاتا اور میر صاحبان ایک دوسرے کو خدا حافظ کہکر رخصت ہو جاتے!۔ (علیگڈھ میگزین) (پروفیسر) رشید احمد صدیقی

ہندو مُسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی

انجیلِ انسانیت

"من ویزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف وصحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ واخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے ـــــ اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے ـــــ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار لکھنؤ

سنگ راہِ زندگی

یہ بھیانک آندھیاں یہ جان لیوا زلزلے
وقت کے پنجے میں تہذیب و تمدّن کے گلے

صبح گھبرائی ہوئی ہر شام گھبرائی ہوئی
اِس افق سے اُس افق تک تیرگی چھائی ہوئی

اِس کنارے بیقراری اُس کنارے اضطراب
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے روحِ انقلاب

میں بھی مصروفِ عبادت تو بھی سرگرمِ سجود
پھر بھی دُنیا میں نہیں امن و امانت کا وجود

دیر کا نقشہ مکمّل ہے نہ تصویرِ حرم
آہ کس منزل پہ ٹوٹا ہے مصوّر کا قلم

یہ نظر کا کارخانہ وہ نفس کی کارگاہ
زندگی ہے زندگی کے دوش پر بارِ گناہ

وقت کے کس نہج پر چلتا ہے ہستی کا نظام
ہر مسرّت کی سیاست غم کے زیرِ اہتمام

مختلف سانچوں میں ڈھلتے ہیں یہ اجزائے حیات
ایک ہی تصویر بن جاتی ہے لیکن کائنات

روشنی میں تیرگی اور تیرگی میں روشنی
زیست کی تشریح جیسے ایک ہیرے کی کنی

ایک جانب آشیانہ دوسری جانب قفس
ہر خوشی کے قافلے میں غم کی آوازِ جرس

تا کجے یہ تابشِ ایمان و تابِ آگہی
زندگی اب زندگی کے ہاتھ سے جاتی رہی

تم نے بھی مانگیں دُعائیں ہم نے بھی سجدے کئے
ٹمٹماتے ہی رہے لیکن امیدوں کے دئے

ہر نظر زندہ جنازہ ہر نفس زندہ مزار
اُٹھ رہی ہے ہر در و دیوارِ ہستی سے پکار

آستینوں پر لہو جیب و گریباں پر... لہو
غم سے کیونکر بچ کے رہ جائے خوشی کی آبرو

یہ پہاڑی راستہ، اس پر یہ پتھریلی زمیں
لڑکھڑا کر گر نہ جائے رہروِ ہستی کہیں

(ساقی جاوید)

انتخابِ کلام :- بسمل سعیدی ہاشمی

انداز جنوں عشق کے اب جا نہیں سکتے
اب دل سے کسی وقت اُمنڈ آتے ہیں بسمل

ہر بندہ و پیرت کو اس طرح ٹھکراتا ہوں میں
دیکھ سکتا ہی نہیں اول تو میں اُن کی طرف

کب سے اُلجھ رہے ہیں دم واپسیں سے ہم
دہرائی جا سکے گی نہ اب داستانِ عشق

الٰہی دُنیا میں اور کچھ دن ابھی قیامت نہ آنے پائے

کہتے ہیں محبت فقط اُس حال کو بسمل
نہیں اپنے کسی مقصد سے خالی کوئی بھی سجدہ

دل اُنکا جان اُنکی، عشق اُن کا آرزو اُن کی

ٹھوکر کسی پتھر سے اگر کھائی ہے میں نے
جس شخص کی بسمل سے ملاقات ہوئی ہے

ہر چند اُن سے کوئی سروکار بھی نہ ہو

بزمِ نشاطِ کائنات مجھ پہ ہے خندہ زن ہنوز

تم نہ ہوتے اگر زمانے میں،
خدا کے بندے بھی کعبے میں اب نہیں ملتے

آتی ہے ہر طرف سے صدائے درا مجھے،

مایوسیوں کے بعد بھی تو کچھ یہ حال ہے

تم بھی دلِ بیتاب کو سمجھا نہیں سکتے
وہ اشک جو آنکھوں میں نظر آ نہیں سکتے

کوئی یہ سمجھے کہ جیسے ٹھوکریں کھاتا ہوں میں
دیکھ لیتا ہوں تو پھر دیکھے چلا جاتا ہوں میں

دو اشک پونچھنے کو تری آستیں سے ہم
کچھ وہ کہیں سے بھول گئے ہیں، کہیں سے ہم

ترے بنائے ہوئے ہر کو ابھی میں انساں بنا رہا ہوں

جس حال کو ہم اُن سے بھی اکثر نہیں کہتے

خدا کے نام سے کرتا ہے انساں بندگی اپنی
مگر با اینہمہ کچھ اُن پہ قرباں کر رہا ہوں میں

منزل کا نشاں بھی اُسی پتھر سے ملا ہے
وہ شخص محبت کے پیمبر سے ملا ہے

بنتی نہیں ہے اُن کی تمنا کیے بغیر

خلوتِ غم میں تو ابھی اور مجھے رُلائے جا

کس سے اُٹھتا ستم زمانے کا
صنمکدے میں خدا بھی بنائے جاتے ہیں

کن مرحلوں میں چھوڑ گیا قافلہ مجھے،

بیٹھا ہوا ہوں جیسے ابھی انتظار میں

لذتِ غم

(نوجوان بیٹے کی موت پر)

صبحدم شادابیِ گل کی فراوانی بھی دیکھ
پھر چمن سے دور نکہت کی پریشانی بھی دیکھ

اے گرفتارِ فریبِ رنگ و بو ہشیار باش
اپنے پھولوں کا آلِ چاک دامانی بھی دیکھ

چاندنی میں بحر کی لہروں کی تابانی بھی دیکھ
تو انھیں موجوں میں پھر کشتی کو طوفانی بھی دیکھ

کشتی و ساحل کی دھومیں سیرِ گلشن تا کجا
آ مرے غم کا تماشا میری ویرانی بھی دیکھ

لوگ کہتے ہیں مسرت ہے شبابِ زندگی
میں سمجھتا ہوں مسرت کو حجابِ زندگی

زندگی کے واسطے درکار ہے سوز و گداز
تلخیٔ غم ہی سے ہے کیفِ شرابِ زندگی

زندگی محدود کر دوں کیوں خوشی کے واسطے
غم میں بھی ہوتی ہے لذت آدمی کے واسطے

جس کے احساسِ الم سے چاک تھا دامانِ صبر
آج روتا ہوں اسی آشفتگی کے واسطے

وہ دعاؤں پر دعائیں اشکِ حسرت صبح تک
وہ نیازِ بندگی نازِ مشیت صبح تک

چاند کی کرنوں سے باتیں وہ ستاروں سے خطاب
اور بالیں پر چراغِ شامِ غربت صبح تک

لاکھ راتیں تجھ پہ صدقے اے پریشانی کی رات
کیا ہوئی یارب مری آشفتہ سامانی کی رات

قطرہ ہائے اشک سے دامن پہ تاروں کا سماں
ہائے وہ میری بہارِ سوزِ پنہانی کی رات

ہر نفس میں زندگی صبرِ دلِ ایوبؑ کی
دل کے داغوں میں سپیدیٔ دیدۂ یعقوبؑ کی

کس قدر تھی کیف آگیں ظلمتِ شامِ الم
اک سیاہی تھی غلافِ کعبۂ محبوب کی

اب وہ تسکین آفریں باتیں وہ غمخواری کہاں
وہ مناجاتیں کہاں، راتوں کی بیداری کہاں

ہو گیا خاموش کوئی ہو گئے افسانے ختم
شمع کے آنسو کہاں شبنم کی خونباری کہاں

شب کی محفل لٹ گئی سورج اگر آیا تو کیا
خون انجم ہو چکا نورِ سحر آیا تو کیا،

بند کیں بیمار نے آنکھیں ہوئی بالیں اداس
اب زمانہ نعش پر با چشمِ تر آیا تو کیا،

دل کی ویرانی کو رونق دے رہے ہیں دل کے داغ
آسماں پر ہے مری خانہ خرابی کا دماغ

از زمیں تا آسماں ہے میری بربادی کی دھوم
چھپ گیا تارا۔ چلی آندھی۔ بجھا گھر کا چراغ

تیرے غم نے دل کو بے شوق و تمنا کر دیا
اے صلاح الدین تو نے مجھ کو تنہا کر دیا

اب نہ وہ تعلیم کی کوشش نہ فکرِ تربیت
مرنے والے تو نے میرا بار ہلکا کر دیا

تو نہیں تو گھر میں فکرِ ساز و ساماں کیا کروں
کوئی مقصد بھی تو ہو جینے کا ارماں کیا کروں

دل بھی صابر ہے زباں پر شکر کے کلمات بھی
میرے مالک میں علاجِ چشمِ گریاں کیا کروں

روشنی عرشِ بریں کی زیرِ مدفن چاہیے
روح کو طوبےٰ کی ڈالی پر نشیمن چاہیے

نازک و معصوم ہے فطرت صلاح الدین کی
مورِ جبل کے واسطے حوروں کا دامن چاہیے

محمد انتظام اللہ شہابی

قطعات :- (وسیم سمبھی)

وہ لرزتے ہونٹ اک بیکس کے ہنگامِ سوال — جیسے موجِ مضطرب ساحل سے ٹکرایا کرے
جس طرح طائر کوئی اُڑ جائے شاخِ بید سے — اور وہ مانوسِ غم تا دیر تھرایا کرے

کہیں سہاگ نہ لُٹ جائے شوخ کلیوں کا — ہوائے صبحِ چمن عطر بار آ نہ سکے،
ابھی نہ جاؤ کہ میں اور دیکھ لوں دم بھر — پھر اس دیار میں شاید بہار آ نہ سکے

کس قدر تیرہ و تاریک ہے اللہ یہ رات — کاہشِ غم کا ابھی شام کا تارا بھی گیا
مسکراتا ہوا مغرب کی طرف چاند گیا — ٹمٹماتی ہوئی شمعوں کا سہارا بھی گیا

نیر مقدم ہے بہاراں کا شبستانوں میں — جیسے اِک شوخ سرِطور چراغاں کر دے
دور آکاش پہ دیپک سے جلانے والے — مری دُنیا میں بھی اک شمع فروزاں کر دے

میں چلا جاؤں گا شکوہ نہ کروں گا لیکن — یوں نہ راتوں کو فسانوں سے سنوارے گا کوئی
وحشتِ دل سے اگر کھیلنے والا بھی ملا، — اپنی جیتی ہوئی بازی تو نہ ہارے گا کوئی

وائے حسرت کہ مری پیاس بجھا بھی نہ سکے — تری سرشار نگاہوں کے چھلکتے ہوئے جام
مری زرکار تصور میں امانت ہے ابھی — جاتے جاتے ترا اے دوست وہ معصوم سلام

غزل :-

دل سے ابھی خیالِ محبت گیا نہیں — یعنی سکون و صبر سے میں آشنا نہیں
نکلے تھے جستجو کو تری بر بنائے شوق — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اپنا پتا نہیں
یادش بخیر جوشِ جنوں کی لطافتیں — اب بھی وہی چمن ہے مگر وہ فضا نہیں
اچھا ہوا کہ حسرتِ جاوید مل گئی، — صدمہ تو انتظار کا مجھکو رہا نہیں
اس طرح بجھ گئی ہے طبیعت کہ کیا کہوں، — یوں مٹ گیا ہے درد کبھی جیسے تھا نہیں

اکرم دھولیوی

غزل :- تلخیٔ غمِ زیست بھی ہوتی ہے گوارا — بنتا ہے کبھی دل کے لئے غم بھی سہارا

اپنی نہ خبر تھی مجھے - کیا ذکر تمہارا — تھا ایسا بھی اِک دورِ محبت جو گزارا
پندارِ غمِ عشق کی معراج نہ پوچھو — حد ہے کہ نگاہوں سے بھی اُن کو نہ پکارا
مشکل تو نہیں ترکِ تمنا مجھے - لیکن — افسردہ نگاہی تری کیونکر ہو گوارا
جس کی نہ خبر ہو سکی خود قہر مجھے بھی — اس طرح بھی اُن کو شبِ غم دل نے پکارا

منیر الکبر آبادی

مطبوعات موصولہ

شعروشاعری (ہندی) از ایودھیا پرشاد گویلیہ - ناشر بھارتیہ ودیا پیٹھ کاشی قیمت آٹھ روپئے مجلد - ادھر تھوڑے دنوں سے ہندی ادب سے دلچسپی لینے والوں میں یہ صحت مند جذبہ پیدا ہو رہا ہے کہ وہ ملک کی ایک بہت ہی اہم اور ترقی یافتہ زبان اُردو کے متعلق کچھ جانیں، جس کی شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید کی رفتار ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں بہت تیز اور سنجیدہ رہی ہے لیکن اس بات کا لحاظ کم رکھا جا رہا ہے کہ تنقیدیں اور مضامین عالمانہ یا انصاف پسندانہ نقطۂ نظر سے لکھے جائیں - زیر نظر کتاب چھ سو بیس صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے اور مصنف کی محنت کا واضح ثبوت ہے لیکن اس میں بھی بعض ایسی غلط بیانیاں ہیں جو معمولی مطالعہ اور ادبی دیانتداری کے معمولی احساس سے دور کی جا سکتی تھیں - مثلاً اُردو کی پیدائش کے سلسلہ میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ امیر خسرو نے ایک قومی زبان کو جنم دیا لیکن اس کی تہذیبی حیثیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے عروج کو غیر قومی اور بدیسی کہا گیا ہے - مصنف نے ولی دکنی پر بار بار یہ الزام لگا ہے کہ اُنھوں نے فارسی الفاظ استعمال کر کے اُردو کی ہندوستانیت کو فنا کر دیا لیکن اس پر بالکل غور نہیں کیا کہ ہندو مسلمانوں کے تہذیبی اختلاط اور فارسی ادب سے ہندوستانیوں کی عام واقفیت کے پیش نظر یہ کوئی تعجب خیز بات نہ تھی - اِس کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں کھڑی بولی کے اس روپ کی جسے اُردو کہتے ہیں یہی خصوصیت تھی کہ وہ اپنی ضرورت کے لئے کام کے الفاظ لے کر اپنا ذخیرہ وسیع کر رہی تھی اس کے برعکس دوسری بھاشائیں اپنے اپنے لسانی حلقوں میں محدود ہو گئی تھیں اور بڑھتی ہوئی زندگی کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں - اب اُردو کی ابتدا اور ارتقا کے متعلق اتنا مواد جمع ہو چکا ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد صحیح نتائج نکال لینا مشکل نہیں ہے -

اِسی طرح غزل کے متعلق مصنف کی رائے صحیح نہیں ہے - اُس پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں اُن سے یہ خیال ہوتا ہے کہ گویلیہ صاحب نے یہ اعتراض محض اعتراض کرنے کے لئے کئے ہیں کیونکہ آگے چل کر انھوں نے گل و بلبل، صحرا و چمن، میخانہ و شراب کی جو تشریح کی ہے اور اچھے غزل گویوں کا جو انتخاب دیا ہے اُس سے اُن کے ذوق کے متعلق اچھی رائے قائم کی جا سکتی ہے - بہت سی اور بحث طلب باتیں اس کتاب میں پائی جاتی ہیں اور بعض ایسی ہیں جن کا تنقیدی نقطۂ نظر سے کوئی تعلق نہیں اور جن سے اُن لوگوں میں اُردو کے متعلق اور غلط فہمی پھیلے گی جو پہلے ہی سے اُس سے جذباتی مخالفت رکھتے ہیں - ہمیں یقین ہے کہ جب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن نکلے گا اُس وقت نہ صرف اس میں ضروری ترمیمیں کر لی جائیں گی بلکہ اس کا لب و لہجہ بھی درست کر لیا جائے گا - تمہیدی حصہ میں خاص طور سے غلط فہمیوں کی بہتات ہے -

شعر و شاعری کے دس حصے ہیں جن کے عنوانات یہ ہیں:- ابتداء، ترنگ، افتتاح، سنگم، روشنی، نیا سویرا، بیداری، سعی کامراں، ترقی پسندی اور موجِ شیریں - ان دس ابواب میں اکتیس شعراء کا انتخاب دیا گیا ہے جن میں میر تقی میر سے لیکر ساحر لدھیانوی تک سبھی اہم شعراء شامل ہیں بعض شعراء جن کو ہونا چاہیئے تھا شامل نہیں ہیں لیکن ایسے انتخابات میں اکثر شعراء کے اچھے شعراء در مشہور نظمیں دی گئی ہیں - ہندی دانوں کی سہولت کے لئے مشکل الفاظ کے معنی فٹ نوٹ میں دئے گئے ہیں - کتاب نہایت سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے اور اچھی طباعت سے مزین ہے - اس کی زبان البتہ ملی جلی ہے - کہیں کہیں بالکل اُردو کے قریب ہے اور کہیں بہت مشکل ہندی - اگر مصنف نے تھوڑی سی توجہ کی ہوتی تو زبان میں ایسی یکسانیت پیدا کی جا سکتی تھی جو اسے آسان ہندی یعنی ہندوستانی سے قریب کر دیتی -

کتاب کا تعارف مہا پنڈت راہل سانسکرتیاین نے لکھا ہے - موصوف سنسکرت اور پالی کے بہت بڑے عالم ہیں - دُنیا کی بہت سی زبانوں سے واقف ہیں لیکن اپنے تعارف میں انھوں نے بھی اُردو کے بدیشی ہونے کا ذکر کیا ہے، گو اس کا پیرایہ دوسرا ہی اس تعارف میں بھی بہت سے بحث طلب مسئلے اور اعتراضات ہیں جنھیں اُردو کے نقاد اور ادیب تسلیم نہیں کرتے - مثلاً فارسی عربی کے لفظوں کے استعمال، بحروں کے انتخاب وغیرہ کا ذکر راہل جی نے بھی اس طرح کیا ہے گویا یہ سب کچھ کسی سازش کے ماتحت ہو رہا تھا کہ ہندی بحروں کا "بائیکاٹ" کیا جائے - یہ خیال تاریخی اور علمی نقطۂ نظر سے بہت غلط ہے حالانکہ موصوف نے خود ہی اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں نے موسیقی میں ہندوستانی موسیقی کا "بائیکاٹ" نہیں کیا - شعر و ادب میں "بائیکاٹ" موسیقی اور تعمیر میں اختلاط کیا اس کا سبب ہندی کے نقاد بتا سکیں گے ؟ بالکل ناممکن ہے کیونکہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے - اس کی تہ میں سب سے بڑی غلط فہمی یا غلط بیانی کام کر رہی ہے کہ زبان کا تعلق مذاہب سے ہے -

بہر حال اس تبصرے میں اِن مباحث کے اُٹھانے کا موقعہ نہیں ہے - کتاب بڑی محنت سے مرتب کی گئی ہے اور ہندی دانوں کو چند اچھے شعراء سے روشناس کرنے میں مدد دے گی - اُردو دانوں کے لئے بھی ایسی کتابیں مرتب کرنے کی ضرورت ہے جن کی مدد سے وہ ہندی شاعری کی خصوصیات کو سمجھ سکیں -

ناموران عرب مصنفہ نواب محمد صابر قلی خاں صفدر جنگ فرمانروائے ریاست محمد گڑھ - ناشر:- سید سلیمان پبلشنگ ہاؤس محمد گڑھ - قیمت عہ - اس تصنیف میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، سرزمین عرب کی ان مخصوص ہستیوں کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے، جنھوں نے اس بے آب و گیاہ ریگستان کو اخلاق و تہذیب کا سرچشمہ بنانے میں مدد دی اس مجموعہ کا حصۂ اول خاتم المرسلین کے ذکر سے شروع کیا گیا ہے جو گل سرسبد کی حیثیت رکھتا ہے اور عبداللہ ابن زبیر پر ختم ہوتا ہے - دوسرے حصہ میں امام مالک، محمد بن عبدالوہاب، امیر مسعود اعظم، سلطان عبدالعزیز اور امام یحییٰ والی یمن کا ذکر کیا گیا ہے - یہ کتاب تاریخ عرب کے تمام اکابر کے ذکر پر حاوی نہیں، بلکہ صرف ان چند ہستیوں کے ذکر تک محدود ہے، جن کا مطالعہ فاضل مصنف نے زیادہ انہماک کے ساتھ کیا اور جن سے ان کو خاص شغف حاصل ہے -

اس نوع کی تصانیف میں دو خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے، ایک یہ کہ جو کچھ لکھا جائے وہ تاریخی حیثیت سے صحیح ہو، دوسرے یہ کہ انداز بیان میں مورخانہ سادگی و سنجیدگی پائی جائے اور ہم کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اس میں یہ دونوں خصوصیات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں - ہر چند عنفوان شباب میں اس نوع کی پیرانہ سری کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی لیکن بعض نوجوانوں میں فطری طور پر وقت سے پہلے ہی پختگی عقل پیدا ہو جاتی ہے اور یہ مفکرانہ رجحان، عمر کے ساتھ ساتھ ان کا ذاتی جوہر ہو جاتا ہے - اور فاضل مصنف بھی انھیں میں سے ایک ہیں - ہمیں امید ہے کہ وہ اپنی اس فطری اہلیت سے کام لیکر تصنیف و تالیف کے شغل کو جاری رکھیں گے تاکہ آیندہ وہ اکابر مصنفین کے صف میں جگہ پا سکیں -

صبوحی مجموعۂ قطعات رباعیات ہے، سید ضیا جعفری سرحدی کا جسے انجمن ترقی اُردو سرحد پشاور نے شایع کیا ہے - جناب ضیا ہندوستان کی سرزمین میں اجنبی ہوں، لیکن سرحد میں وہ کافی مشہور ہیں اور نہایت خوشگو شاعر سمجھے جاتے ہیں -

میں نے بھی ان کا نام اس سے قبل نہ سنا تھا، لیکن اب ان کا مجموعہ دیکھنے کے بعد مجھے اپنی اس بے خبری پر افسوس ہوا - ان کے خیالات بلند، جذبات پاکیزہ اور اسالیب بیان بہت شگفتہ ہیں -

ان کی مادری زبان فارسی ہے اور اول اول وہ فارسی ہی میں شعر کہتے تھے، لیکن بعد کو اُردو میں بھی شعر کہنا شروع کیا اور اس انداز سے گویا آپ نے ہمیشہ اس زبان میں شاعری کی ہے - اس مجموعہ کے اخیر میں ایک حصہ سرود پہلوی کے نام سے ان کے فارسی قطعات پر مشتمل ہے اور بہت خوب ہے، قیمت دو روپیہ - کتابت و طباعت وغیرہ نفیس -

اسلامی تعلیمات تصنیف ہے میر ولایت علی صاحب کی جس میں بعض اسلامی عقاید و تعلیمات قرآن پر روشنی ڈالی گئی ہے - جو نہ بالکل مولویانہ ہے نہ فلسفیانہ - بالکل اسکے بین بین مصلحانہ انداز رکھتی ہے - فاضل مصنف کا اس تصنیف سے مقصد یہ ہے کہ عقایدی تعصب کو دور کر کے تمام نوع انسانی کو ایک ہی رشتۂ اتحاد سے وابستہ کر دیا جائے - مقصد اس میں شک نہیں بہت بلند و پاکیزہ ہے، لیکن جب تک مسلمان اپنے عقاید دینی میں کوئی متصوفانہ لچک پیدا نہ کریں، یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اس تصنیف میں اس لچک کی پوری رعایت رکھی گئی ہے - اس کتاب میں علمی و تعمیری حیثیت سے بھی کوئی پروگرام ایسا پیش نہیں کیا گیا جس سے یہ مقصود پورا ہو سکے - تاہم پند و موعظت کی حد تک اس کے مفید ہونے میں شک نہیں -

قیمت چار روپیہ چار آنہ - ملنے کا پتہ :- اعظم پورہ مشرقی - روبرو مسجد اعزہ - مکان نمبر ۳۲۱ حیدر آباد دکن

سیاسیات کے اصول تصنیف ہے میر نثار علی کوثر کی - جسے اُردو محل حیدر آباد نے شایع کیا ہے اس کتاب میں مصنف نے سیاسیات، مملکت، اقتدار اعلیٰ - قانون، حقوق و آزادی، شہریت، مملکت کی تنظیم وغیرہ بحث کر کے ایک ایسی چیز پیش کی ہے جس کے مطالعہ سے سیاسیات کے تمام مبادیات اور اساسی اصول سامنے آجاتے ہیں -

اِس وقت جبکہ سیاسیات کا علم ہماری ضروریات زندگی میں داخل ہو گیا ہے، ایسی کتابوں کی اشاعت بہت مفید ہے تاکہ ہم خود سمجھ سکیں کہ حاکم و محکوم کا تعلق کیا معنی رکھتا ہے اور ایک دوسرے کے حقوق و مطالبات کیا ہونا چاہئے - قیمت دو روپیہ چار آنہ -

حریم کا دسترخوان نمبر

لکھنؤ کا ماہنامہ حریم جو گزشتہ ۲۰ سال سے مسلسل شایع ہو رہا ہے اپنی نوعیت کے اعتبار سے خواتین کا واحد رسالہ ہے۔ جس نے مغربی تہذیب و تمدن کی آزادی سے ہندوستانی خواتین کو بچانے کے لئے بڑی جدوجہد کی ہے۔

حریم کا ہر سال ایک خاص نمبر شایع ہوتا ہے۔ امسال اس کا ایک خاص نمبر دسترخوان نمبر کے نام سے شایع ہوا ہے جس میں کھانا پکانے کی ترکیبیں اتنی وضاحت سے لکھی گئی ہیں کہ ناتجربہ کار بچیاں بھی انھیں پڑھ کر اچھا خاصہ کھانا پکا سکتی ہیں، کھانوں کے ساتھ ہی مٹھائیوں، مربوں، اچار اور چٹنیوں وغیرہ کے بنانے کی ترکیبیں بھی شایع کی گئی ہیں۔ دسترخوان نمبر نہایت خوبصورت اور مضبوط جلد کے ساتھ شایع کیا گیا ہے اور شاید اُردو کے رسایل میں یہ پہلا سالنامہ ہے جو مجلد شایع ہوا ہے، اس نمبر کی قیمت دو روپیہ ہے لیکن حریم کے سالانہ خریدار کو مفت ملتا ہے۔ سالانہ چندہ پانچ روپیہ پانچ آنے ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ ماہنامہ حریم لکھنؤ۔

دس ہزار روپیہ کی اصلی گھڑیاں مُفت انعام

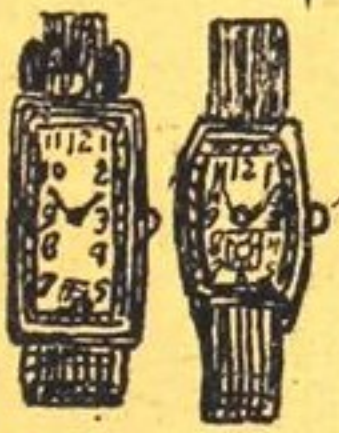

ہمارے کالا تیل نمبر ۱۰۵ رجسٹرڈ کے استعمال سے بال ہمیشہ کے لئے کالے ہو جاتے ہیں اور پھر عمر بھر کالے پیدا ہوتے ہیں ۔ یہ ہمارے سوامی جی کی طرف سے لاجواب تحفہ ہے۔

یہ تیل گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے، ان کو لمبے، گھونگھر والے اور چمکدار بناتا ہے۔ جہاں بال نہ اُگتے ہوں وہاں پھر سے پیدا کرتا ہے۔ آنکھوں کی روشنی کو تیز کرتا ہے۔ دماغ کو ٹھنڈک پہونچاتا ہے۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے اکسیر ہے ۔ شوقینوں کے لئے عمدہ تحفہ ہے۔ قیمت ایک شیشی دو روپیہ آٹھ آنے۔ تین شیشی کے پورے کورس کی رعایتی قیمت چھ روپیہ آٹھ آنے۔ اس تیل کو مقبول بنانے کے لئے کمپنی ہر شیشی کے خریدار کو ایک انگوٹھی امریکن سونے کی اور ایک اصلی امریکن کلائی کی گھڑی جس کی گارنٹی ۱۲ سال کی ہے مُفت دیجاتی ہے۔

نوٹ:۔ تین شیشی کے خریدار کو چھ انگوٹھیاں امریکن سونے کی اور تین امریکن رسٹ واچ مفت انعام دیجاتی ہیں۔
آج ہی آرڈر بھجوایئے کیونکہ یہ رعایت صرف چند دنوں کے لئے ہے۔ ناپسند ہونے پر واپسی قیمت کی گارنٹی ہے۔

سنیاسی آیورویدک فارمیسی (N.L) حلقہ نمبر ۲۲ - امرتسر

عام طور سے بین کے معنے ہیں کسی خاص غم کے موقع پر مختلف طریقوں سے بیان کر کے رونا جو عورتوں ہی کے لئے مخصوص ہے مگر مرثیوں میں امام علیہ السلام اور ان کے انصار نے بھی بین کئے ہیں اور عورتوں کے بین سے کسی طرح مختلف نہیں ہیں۔

بین نگاری کے سلسلہ میں ایک اور چیز قابلِ ذکر ہے جس کو بیان مصائب کہتے ہیں۔ گو اس میں بین کی رسمی و رواجی شکل نہیں ہوتی، لیکن اس کا مقصود بھی چونکہ سامعین کے دل میں گداز پیدا کرنا اور رونے پر آمادہ کرنا ہوتا ہے، اس لئے وہ بھی بین ہی کی دوسری صورت ہے۔ مثلاً بیان مصائب کا ایک ٹکڑا ہم یہاں پیش کرتے ہیں، جس میں امام حسینؑ کی حالت بھائی کے غم میں دکھائی گئی ہے:۔

سنتے ہی اس صدا کے شکستہ ہوئی کمر — تڑپے اُٹھے گرے نہ سنبھالا گیا جگر
کانپے جو پاؤں تھام لیا بازوے پسر — چلاتے تھے کہو علی اکبر چلیں کدھر
خورشید کیوں چھپا ہے یہ کیا واردات ہے
کچھ سوجھتا نہیں ہمیں دن ہے کہ رات ہے

لیکن اس کے بعد ہی یہ بیان، بین کی شکل اختیار کر لیتا ہے:۔

یہ روز قتل حمزہ و جعفر ہے اے پسر — یوم وفاتِ حضرت شبر ہے اے پسر
یہ ماتم شہادتِ حیدر ہے اے پسر — صبر اب کہاں یہ داغ برادر ہے اے پسر
میرا الم بتول کی جائی سے پوچھئے
صدمہ جوان بھائی کا بھائی سے پوچھئے

غربت میں لٹ گیا مرا گھر ہائے ہائے — سیدھی نہ ہوگی اب یہ کمر ہائے ہائے
تازہ ہے آج داغ پدر ہائے ہائے — کاٹا گیا چھری سے جگر ہائے ہائے
عباسؑ کیا جہاں سے گئے ہم گزر گئے
محسنؑ ہوا شہید حسنؑ آج مر گئے

میر انیس کے یہاں صحیح جذبات نگاری کے فقدان کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ واقعیت کا لحاظ انھوں نے بہت کم کیا ہے اور اسی لئے ان کے بیانات میں بہت تضاد پایا جاتا ہے، لیکن چونکہ میر انیس کا مقصود صرف اس طرح کا بین پیش کرنا تھا کہ مجلس میں کہرام برپا ہو جائے اسلئے اسکا بعید از قیاس ہونا ہی ان کے جذباتیت کے بہاؤ کو زیادہ تیز کر دیتا تھا۔

الغرض مرثیوں میں ہر طرف بین ہی بین ہیں۔ اور یہی مرثیوں کی علت غائی ہیں۔ ان کی خصوصیت، اہمیت اور قیمت کے متعلق مختلف رائیں دی گئی ہیں۔ میر انیس کے مداحوں نے ان کو سراہا ہے اور اُن سے نفرت کرنے والوں نے ان پر اعتراض کئے ہیں۔ لیکن ہم کو ان کی شاعرانہ قیمت کے متعلق کچھ سوال کرنا ہیں۔

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ آیا یہ بین انسانی جذبات اور احساسات کے نقشے ہیں یا نہیں؟ مولانا شبلی کی رائے میں یہ سب

انسانی جذبات کی تصویریں ہیں اور مل MILL کی رائے تسلیم کرتے ہوئے وہ اسی کو شاعری بتاتے ہیں لیکن مل کی رائے سے غالباً مولانا مرحوم کو پوری واقفیت نہ تھی - ہماری زبان میں ایک لفظ ہے 'جذبہ' اور دوسرا 'احساس' جو متعدد و مختلف نفسیاتی کیفیات کیلئے استعمال ہوتا ہے لیکن اسوقت ہم اسکے دو پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہیں - ایک وہ پہلو جسے جذبات (SENTIMENT) کہتے ہیں اور دوسرے کا نام ہے جذباتیت (SENTIMENTA LIT) اور ان دونوں میں فرق ہے، ہم کئی جگہ میر انیس کے بینوں کی تشریح کے سلسلہ میں لفظ جذباتیت استعمال کر آئے ہیں - کیونکہ ان بینوں کا مقصد رُلانا ہے اور ان میں جذبات کی جگہ جذباتیت ہی کا ہونا ضروری تھا -

بعض حضرات انیس میں جذبات نگاری بھی پاتے ہیں اور اس کی تعریف میں اتنا غلو کرتے ہیں کہ شیکسپیر کی تمثیلوں سے زیادہ بڑھا دیتے ہیں، حالانکہ مغربی ادب کے مقابلہ میں وہ کچھ نہیں ہیں -

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مداحی اور بین نگاری میں باہم کیا تعلق ہے اور ان دونوں چیزوں کے اجتماع سے بیک وقت مرثیہ کے مواد پر کیا اثر پڑتا ہے ؟ غور سے دیکھئے تو یہ دونوں متضاد چیزیں ہیں - ہم مدح اس شخص کی کرتے ہیں جو بہت ہی اعلیٰ پایہ کا ہو اور اس شخص کی مدح کر کے اسے اور بھی اعلیٰ دکھاتے ہیں - برخلاف اس کے بین میں ہر ایک شخص کو اپنے سے زیادہ خراب حالت میں دکھاتے ہیں -

ایک طرف شاعری کا یہ تقاضہ تھا کہ امام پر قصیدہ لکھا جائے - دوسری طرف مجلس اور مرثیہ کے لئے یہ ضرورت تھی کہ کچھ توہمات، کچھ احساسات کے پیش نظر ان کو ایسی حالت میں دکھایا جائے کہ جذبۂ غم برانگیختہ ہو اور مجلس پر رقت طاری ہو - اگر انیس یورپ میں پیدا ہوتے اور وہاں کی روایات شاعری کے درمیان پلے ہوتے تو وہ ان دونوں متضاد چیزوں کو ایک ساتھ رکھتے ہی نہیں اور اگر رکھتے تو ان دونوں میں کسی خاص شاعرانہ ربط کی صورت نکال لیتے مگر مرثیوں میں کبھی ایسے ربط قایم کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی - یورپ کے نقطۂ نظر سے یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص کے صبر کی غلو کے ساتھ تعریف کی جائے اور پھر اسی کو روتا، دھوتا اور آہ و زاری کرتا دکھایا جائے - مگر چونکہ مقصود صرف رُلانا تھا اس لئے ان کی مداحی بھی بہت جلد بین کی صورت اختیار کر لیتی تھی اور ان کا ذہن کبھی اس طرف منتقل نہ ہوتا تھا کہ حسینؑ کی تعمیری شخصیت کو اُجاگر کرنا زیادہ بلند بات ہے -

بزم نگاری - اس میں شک نہیں کہ بین نگاری اور بیان بزم دو الگ الگ چیزیں ہیں، مگر میر انیس کے نظریہ کے مطابق بین نگاری بزم نگاری ہی کے دائرے میں آجاتی ہے اور بزم نگاری کا تین چوتھائی سے زیادہ حصہ بین ہی کے دائرے میں آجاتا ہے -

ان کی بزم نگاری میں بعض حصے ایسے بھی ہیں جو بین سے خالی ہیں، لیکن بہت کم - مثلاً ولادت امامؑ کے بیان میں لکھتے ہیں :-

وہ نورِ قمر اور دُر افشانی انجم، تھی جس کے سبب روشنیِ دیدۂ مردم
وہ چہچہے رضواں کے وہ حوروں کا تبسم آپس میں وہ ہنس ہنس کے فرشتوں کا تکلم
میکال شگفتہ ہوئے جاتے تھے خوشی سے
جبریل تو پھولوں نہ سماتے تھے خوشی سے

روشن تھا مدینہ کا ہر اک کوچۂ و بازار — جو راہ تھی خوشبو۔ جو محلہ تھا وہ گلزار
کھولے ہوئے تھا آہوئے شب نافہ تاتار — معلوم یہ ہوتا تھا کہ پھولوں کا ہے انبار
گردوں کو بھی اک رشک تھا زینت نہ بریں کی
ہر گھر میں ہوا آتی تھی فردوس بریں کی

ادھر حضرت فاطمہؑ درد شکم سے بیتاب دکھائی گئی ہیں اور جناب امیر علیہ السلام دعا مانگ رہے ہیں کہ

ناگاہ در حجرہ ہوا مطلع انوار ، — دکھلانے لگے نور تجلی در و دیوار
اسما نے علیؑ سے یہ کہا دوڑ کے اک بار — فرزند مبارک تمھیں یا حیدر کرار
اسپند کرو فاطمہ کے ماہ جبیں پر
فرزند نہیں چاند یہ اترا ہے زمیں پر

اور پھر اسما بچے کے حسن کی تعریف ایک اور بند میں کرتی ہیں۔ اس کے بعد والے بند میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد صلعم بھی قریب ہی کہیں تشریف فرما تھے اور

مژدہ یہ سنا احمدِ مختار نے جس دم — پس شکر کے سجدے کو جھکے قبلۂ عالم ،
آئے طرف خانۂ زہرا خوش و خرم — فرمایا مبارک پسرا اے ثانیٔ مریم
چہرہ مجھے دکھلا دو مرے نور نظر کا
ٹکڑا ہے یہ فرزند محمدؐ کے جگر کا

کی عرض یہ اسما نے کہ اے خاصۂ داور — نہلا لوں تو لے آؤں اسے حجرے سے باہر
ارشاد کیا احمدِ مختار نے ہنس کر — لے آ کہ نواسا ہے مرا طاہر و اطہر
اس چاند کو تا سر افلاک کیا ہے
یہ وہ ہے خدا نے جسے خود پاک کیا ہے

اور اس کے بعد کچھ اور اسی طرح کی باتیں حضرت صلعم فرماتے ہیں ـــ اسما جا کر نومولود کو لے آتی ہے اور اس بچہ کو دیکھ کر محمدؐ کی بیحد خوشی کا عالم بیان ہوتا ہے۔ پھر آنحضرت اس نومولود کو قرآن کی طرح دونوں زانو کی رحل پر بٹھاتے ہیں اور پھر حضرت اس کا گلا چوم کر اشک آلود ہوتے ہیں مگر ضبط فرماتے ہیں اور بچے کے کانوں میں اذان و اقامت فرما کر علیؑ سے باتیں کرنے لگتے ہیں دونوں حضرات ایسی خوشی کے موقعوں کی کچھ رسمی سے باتیں کرتے ہیں اور اس کے بعد محمد صلعم ایک عجیب سا سوال کرتے ہیں:

فرمانے لگے ہنس کے شہ یثرب و بطحا — بھائی کہو فرزند کا کچھ نام بھی رکھا

منطقی لحاظ سے یہ سوال بہت عجیب معلوم ہوتا ہے ـــ کیونکہ بچہ ابھی پیدا ہوا ہے۔ محمدؐ اور علیؑ دونوں اسی

جگہ موجود ہیں اس حالت میں ایسے سوال کا بے موقعہ ہونا ظاہر ہے۔ خیر حضرت امیر لکھنؤ کے سعید داماد کی طرح عرض کرتے ہیں:۔

کی عرض یہ حیدر نے کہ اے سید والا — سبقت کروں حضرت پہ یہ مقدور ہے میرا

اور محمد صلعم نے بھی

فرمایا کہ موقوف ہے یہ رب علا پر — میں بھی سبقت کر نہیں سکتا ہوں خدا پر

اتنے میں حضرت جبرئیل نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا نے اس بچے کا نام حسینؑ رکھا۔ لفظ حسین کے ہر حرف کی تعریف کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ یہ بچہ توقیر۔ شجاعت۔ صبر ہر صفت میں یکتا ہوگا۔ پھر آکر بچے کی زیارت کرتے ہیں اور تعریف کرنے کے بعد رونے لگتے ہیں اور رو رو کر محمدؐ کو اس بچے کی شہادت سے آگاہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد محمدؐ بین فرماتے ہیں اور علیؑ اور فاطمہؑ بھی الگ الگ بین کرتے ہیں۔ اس موقع پر ایک بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ جبرئیل کے انکشاف کے بعد محمدؐ ایسی باتیں کرتے ہیں جیسے کہ انکو بالکل پہلی مرتبہ ہونے والی شہادت کی اطلاع ملتی ہے مگر کچھ ہی پہلے محمدؐ، حسینؑ کا گلا چوم کر ضبط گریہ کرتے ہوئے بتا چکے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کو سب کچھ پہلے ہی سے معلوم تھا۔ ایسی غلطیاں میر انیس کے یہاں بکثرت ہیں۔

بزم نگاری کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو، جب حضرت قاسم شہید ہو گئے تو حضرت عباسؑ نے اجازت طلب کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر ان کو معلوم تھا کہ امام ان کو اجازت آسانی سے نہ دیں گے اس لئے حضرت عباس" اشارتاً فرماتے ہیں:۔

واللہ کہ قاسم کی بھی تقدیر تھی کیا خوب — سامان وہی ہو گیا جو تھا انھیں مطلوب
سرسبز ہوا سید مسموم کا محبوب — اک ہم ہیں کہ بہنوں سے خجل بھائی سے مجبوب

منہ زینبِ ناشاد کو دکھلا نہیں سکتے
بھاوج کے بھی پُرسے کے لئے جا نہیں سکتے

اس پر شاعر ہم کو بتاتا ہے کہ:۔ — سمجھے شہ والا یہ کنایہ یہ اشارہ

اور شہ والا نے ایک تقریر کی جس میں حضرت عباس کے صبر کی تعریف کرتے ہوئے کہا:۔

ہم تم سے رضا رن کی طلب کرتے ہیں بھائی

حضرت عباسؑ اس پر تھرا گئے۔ امام حسینؑ تقریر فرماتے ہیں:۔

شہ نے کہا چل جائے گا جب حلق پہ خنجر — مقتل سے اُٹھانا مرے لاشے کو برادر

وغیرہ وغیرہ اور حضرت عباس پر رقت طاری ہو گئی اور امام بھی راضی ہو گئے۔ "اچھا وہی ہو دیگا جو مرضی ہو تمہاری"

اس کے بعد:۔ یہ کہہ کے سوئے خیمہ چلے روتے ہوئے شاہ — عباس بھی تھے قبلۂ کونین کے ہمراہ

فضہ نے کہا زینبِ دلگیر سے ناگاہ، — میدان سے آتے ہیں ادھر سیدِ ذیجاہ

ہے ریش بھی تر اشکوں سے رخسار بھی نم ہے
رومال ہے آنکھوں پہ کمر ضعف سے خم ہے

خیر دونوں حضرات خیمہ میں داخل ہوتے ہیں اور سب بیبیاں ایک اضطراب کے عالم میں آجاتی ہیں۔ حضرت زینب دونوں بھائیوں کے استقبال کے لئے ڈیوڑھی تک آتی ہیں۔ دونوں کی بلائیں لیتی ہیں اور دعائیں دیتی ہیں۔ امام حسینؑ بتاتے ہیں کہ حضرت عباسؑ رخصت رن کی مانگ رہے ہیں۔ اس پر حضرت زینب یوں سمجھاتی ہیں:۔

بولی کہ نہ بھائی یہ کبھی ان سے نہ ہوگا،
ہے درپئے آزار و جفا لشکرِ اعدا — اس وقت میں عباس تمھیں چھوڑیں گے تنہا
حجت انھیں کچھ جانے نہ جانے میں نہیں ہے
ایسا تو وفادار زمانے میں نہیں ہے

اور پھر حضرت عباسؑ کی تعریف کرنے لگتی ہیں۔ اس پر

حضرت نے اشارہ کیا تم بھائی کو سمجھاؤ

اور حضرت زینب نے حضرت عباسؑ کو الگ لیجا کے سمجھانا شروع کیا۔ حضرت عباس نے جو خاص بات کہی وہ یہ تھی:۔

رو کو نہ مجھے سید ابرار کا صدقہ

حضرت زینب کچھ کہہ نہیں پاتیں اور یہی کہتی ہیں:۔ سمجھانے کو بھیجا ہے مجھے شاہ زمن نے
فرمائیں گے کھویا مرے بھائی کو بہن نے

اور — یہ کہہ کے گئی شہ کے قریں زینبِ بے پر — عباس بھی ہمراہ تھے نہوڑائے ہوئے سر
حضرت نے اشارہ کیا کیوں کیا ہوا خواہر — کی عرض نہیں مانتے عباسؑ دلاور
منظور ہے صدقے ہوں شہنشاہ امم پر
سمجھاتی ہوں جب میں تو یہ گرتے ہیں قدم پر

پھر حضرت عباسؑ امام حسینؑ کے قدموں پر گر پڑتے ہیں اور امام حسینؑ ان کو سینہ سے لگا لیتے ہیں اور اجازت دیدیتے ہیں۔ حضرت عباسؑ کو امام حسین کی سب سے چھوٹی صاحبزادی سکینہ سے بہت محبت تھی اور اس وقت حضرت بانو حضرت سکینہ کو بیدار کرتی ہیں اور وہ

صاحبزادی۔ — یہ سنتے ہی گھبرا کے چلی جلد وہ بے آس — اودے ہوئے جاتے تھے لب لعل یہ تھی پیاس
زینب نے کہا آئی ہے لو عاشقِ عباس — عباس نے گودی میں لیا آکے بصد یاس
بہتے تھے جو آنسو خلف شیرِ خدا کے،
سوکھے ہوئے لب ملنے لگی منہ سے چچا کے

پھر — عباس نے رو کر کہا کیا چاہئے جانی، — شرما کے سکینہ نے یہ کی عرض کہ پانی
عباس نے فرمایا بصد اشک فشانی — اللہ بجھائے گا تری تشنہ دہانی

لو گود سے اُتر دو تو ہم اب جائیں سکینہ
لے آؤ کوئی مشک تو بھر لائیں سکینہ

غرض مشک آجاتی ہے اور سکینہ بچوں کی سی بات کہتی ہیں:-

یوں کہنے لگی رو کے وہ شبیر کی جائی، میں رن میں چلی آؤنگی گر دیر لگائی،
جلد آؤ، گا دریا سے یہ فرما کے سدھارو
جاتے ہو تو آنے کی قسم کھا کے سدھارو

حضرت عباس ان کو اسی طرح کا جواب دیتے ہیں مگر اس پر سکینہ، امام حسینؑ سے متوجہ ہو کر جو باتیں کہتی ہیں ان میں پہلی بات تو بچوں کی سی ہے مگر آگے جو باتیں آتی ہیں وہ اگر کسی بچے کی ہو سکتی ہیں تو ایسے بچے کی جو بوڑھوں کی طرح باتیں کرنا سیکھ ہی نہ گیا ہو بلکہ بوڑھا بھی ہو گیا ہو:-

بابا سے یہ کہنے لگی وہ حور شمائل کیوں مشک انھیں دوں کہ نہ دوں اے شہ عادل
ہر چند کے بے آب مری زیست ہے مشکل صدقے گئی سینے میں دھڑکتا ہے مرا دل
حضرت نے سنیں حضرتِ عباس کی باتیں
ماتم کی خبر دیتی ہیں یہ یاس کی باتیں

خیر سکینہ حضرت عباس کو مشک دے دیتی ہیں اور حضرت عباس

یوں خیمہ کے پردہ سے وہ سفدر نکل آیا
گویا کہ قمر برج سے باہر نکل آیا

یہ مثال میر انیس کے بزم کا رنگ پورے طور پر نمایاں کرتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے Situation / قصہ کی ساخت اور کردار نگاری کے لحاظ سے اس میں متعدد غلطیاں ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ انیس بڑے نفسیات نگار تھے، لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے۔

ادب میں نفسیات پیش کرنے کے متعدد طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ عام انسانوں کی عام فطرت کے بابت عام باتیں کہی جائیں۔ دوسرا یہ کہ خاص افراد کی خاص اور انفرادی خصوصیات کو ظاہر کیا جائے۔ تیسرے درجہ کی نفسیات نگاری اس سے بھی اونچے درجہ کی ہے۔ اس میں مرکب COMPLEX قسم کے افراد سامنے لائے جاتے ہیں یعنی ایسے اشخاص جن میں انفرادیت اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہے

ان تینوں صورتوں کو سامنے رکھ کر ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر انیس نفسیات نگار تھے بھی تو محض ابتدائی درجہ کے اور اس سے آگے وہ جا بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کی روایات میں اونچی نفسیات نگاری کا موقعہ ہی نہیں تھا۔

کردار نگاری مختلف نفسیاتی جزئیات کو ملا کر ایک کل کی تخلیق ہے۔ کردار ایک یا دو مصرعوں میں نہیں آسکتا اگر ہم کسی ہستی کو مختلف جگہوں پر مختلف حالتوں میں مختلف خواہشوں کے تحت کام کرتے دکھائیں اور ہر حالت میں اس کی کچھ انفرادی صفات نمایاں کریں اور

ان مختلف صفات کو ایک جگہ کرنے پر ایک ایسا کل ذہن میں آئے جو جیتے جاگتے انسانی افراد کی طرح معلوم ہو تو ایسی تخلیق کو ہم کردار کہیں گے - مرثیوں میں بھی جزئیات ہی پر زیادہ زور ہے لیکن جب ہم ان جزئیات کو ملا کر ایک کل بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو ناکامیاب رہتے ہیں آئیے حضرت عباسؑ کے حال والے نو مرثیے سامنے رکھ کر ان حضرت کا کرداری نقشہ سمجھنے کی کوشش کریں - ہم نے حضرت عباسؑ کو اس لئے چھانٹا ہے کہ واقعہ کربلا میں ان کی ہستی اور ان کی انفرادیت سب سے زیادہ نمایاں تھی لیکن جب ہم ان نو مرثیوں کو یکے بعد دیگرے پڑھتے ہیں تو ہم کو واقعات اور بیانات میں اس قدر اختلافات ملتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کریں اور کس واقعہ سے اندازہ لگائیں کہ ان کی نفسیاتی خصوصیات کیا ہیں -

جن مراثی میں ہم کو حضرت عباسؑ کی مدح ملتی ہے ان میں انفرادی صفات کو سامنے رکھا ہی نہیں گیا - جب رخصت کے وقت وہ سامنے آتے ہیں تو ان کی بات چیت میں بھی کوئی انفرادی صفت ہمارے سامنے نہیں آتی، رزم کے سلسلہ میں مبالغہ آمیزیوں کے سوا کچھ نہیں ہے -

واقعۂ کربلا کے تاریخی حالات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عباس کی انفرادی خصوصیت جلال تھی - میر انیس نے بھی ایک جگہ فقط اس جلال کو نمایاں کیا ہے (مرثیہ " جب کربلا میں داخلۂ شاہ دیں ہوا") - یہاں دکھایا گیا ہے کہ جب حضرت عباسؑ کو یزید کی فوج نہر کے کنارے خیمے لگوانے سے روکتی ہے تو وہ جلال کے عالم میں آجاتے ہیں اور ایک لمبی پر جوش تقریر فرماتے ہیں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس کو بھی یہ انفرادی صفت حضرت عباسؑ کی معلوم تھی - مگر اس کو انفرادی بنا کر وہ پیش نہیں کرنا چاہتے تھے - بعض جگہ ان کا جلال متضاد صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ عورتوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں - اسی طرح مرثیوں کے دوسرے کرداروں کے متعلق بھی جو کچھ میر انیس نے بیان کیا ہے اس میں متضاد حالتیں اور بے ربط باتیں موجود ہیں -

بعض حضرات صنف مرثیہ کو افسانوی شاعری اور ڈرامہ کے مقابلہ میں بھی پیش کرتے ہیں جو کسی طرح درست نہیں ہو سکتا کیونکہ مرثیہ اس قدر مختصر صنف ہے کہ اس میں کوئی قصہ معہ اپنے متعدد واقعات کے لایا ہی نہیں جا سکتا - اس میں صرف ایک مختصر افسانے کی جگہ ہے جو ایک ہی واقعہ رکھتا ہو اور واقعہ بھی صرف کربلا کا جس سے ہٹ کر مرثیہ، مرثیہ نہیں رہ جاتا - اگر ہر مرثیہ ایک ہی فرد کے حال میں ہوتا اور اس فرد کی بابت یہ معلوم نہ ہوتا کہ یہ آخر میں شہید ہی ہوگا تو اس میں کچھ افسانے کی سی دلچسپی پیدا کی جا سکتی تھی - مگر مرثیہ میں اس کا سوال ہی نہیں اٹھتا اور اس لئے اس کے مختلف اجزا (تشبیب مدح - بزم - رزم - مصائب وغیرہ) بالکل بناوٹی ہیں اور ان میں کہیں کوئی تاثراتی وحدانیت (unity of impression) نہیں پائی جاتی -

مرثیہ کے مواد میں ڈرامہ کی سی آفاقیت اور ہمہ گیری کی بھی گنجائش نہیں - مرثیہ کے کسی کردار کو انسان تو دکھایا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ وہ ہر گناہ سے بالاتر ہے اسلئے انسانی جذبات جن کا تصادم ہی ڈرامہ کی جان ہے مراثی کے کردار میں نہیں دکھائے جا سکتے -

میر انیس نے اپنے مرثیوں میں جو مصوری کی ہے اگر اس کو ڈرامائی نقطۂ نظر سے جانچا جائے تو اس میں ہم کو

جھول ہی جھول نظر آتے ہیں۔

آخر میں ہم ایک سوال کرتے ہیں جو ہم کو مرثیہ کے تمام مواد کی بابت ایک اہم نتیجہ پر لے جائے گا۔ کیا مرثیوں میں ہمیں انسانی زندگی کے بابت کوئی خاص نقشہ کوئی خاص نظریہ یا کوئی خاص خیال ملتا ہے ؟۔ اس سوال کو تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ اس میں فطرت انسانی کے بابت کوئی انکشاف ہے یا نہیں ؟ دوسرے یہ کہ اس میں جذبات انسانی کا کوئی ایسا پہلو ملتا ہے یا نہیں جو کسی پختہ کار کے دل پر اثر کرے ؟ تیسرے یہ کہ آیا اس میں کسی معاشرت کا کوئی مکمل نقشہ ہے کہ نہیں ؟

اس میں شک نہیں میر انیس فطری طور پر بہت ذہین انسان تھے اور ان کے بیانات میں کبھی کبھی حقیقت نگاری کی جھلک بھی نظر آتی ہے مگر اس میں عامیانہ نفسیاتی باتوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ نہ تو میر انیس انسانیت کے بابت کچھ سوچنا چاہتے تھے اور نہ ان کی مجلس کسی ایسے غور و فکر کی طلبگار تھی اس لئے ظاہر ہے کہ اس صورت میں انسانیت کو کوئی دلچسپ صورت پیش کرنے کی گنجایش کہاں تھی۔ کچھ لوگوں کو رخصت ہوتے ہوئے۔ روتے ہوئے۔ لڑتے ہوئے اور شہید ہوتے ہوئے دکھانا اس قدر محدود دائرہ ہے کہ اس میں کسی وسیع نفسیاتی خیال کو پیش ہی نہیں کیا جا سکتا۔

یہ کہنا تو صحیح ہوگا کہ میر انیس کے مرثیوں میں ان کے زمانے کی لکھنوی تہذیب اور ظاہری اخلاق کی طرف اشارے ضرور ملتے ہیں۔ یعنی مردوں، عورتوں کی عام ذہنیت، طرز آداب و حفظ مراتب باتیں کرنے کے طریقے، بین کر کر کے رونے کے طریقے پر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے۔ لکھنوی معاشرت کا بھی کچھ پتہ ضرور چلتا ہے مگر یہ معاشرت پیش کرنا ان کا خاص مقصد نہیں تھا۔ یہ اشارے ان کو اس کو اس لئے شامل کرنا پڑے کہ ان سے اہل مجلس کے دل میں گداز پیدا ہو اور وہ رونے لگیں۔

مجموعۂ استفسار و جواب تیسرا حصہ

اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بے کار ہے کیونکہ "نگار" کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اس سلسلہ میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔

پہلے دو حصے ختم ہو گئے ہیں

قیمت حصۂ سوم تین روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشار، الیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ، علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲- مادیئن کا مذہب،

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے متذاں شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشار کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے - یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے بادیان طریقت و علمار کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعرار کے کلام پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

قیمت حصۂ اول للہیہ حصۂ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری ۳۹ء

(مصحفی نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- حیاتِ مصحفی - اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ - مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں، انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ -

قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری ۴۰ء

(نظیر نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- نظیر کا مسلک شاعری پر تبصرہ نظیر اور عوام انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

جنوری ۴۵ء

(قرآن نمبر)

اس میں ڈاکٹر شڈل کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں۔ حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ۔

قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری - فروری، مارچ ۴۶ء

یہ سالنامہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور فنِ انتقاد پر ملک کے بہترین اہلِ قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ جنوری کا ہے اور دوسرے حصہ میں فروری، مارچ دونوں نمبر شامل ہیں۔

قیمت ہر حصہ کی ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

جنوری ۴۷ء

اس سالنامہ کا نام "ماجد و لین نمبر" ہے جس میں ایک بے مثل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار تریجڈی کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دُنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کو اس کے وقت اسلام کے درخشندہ دوران کارنامے کو بھولے جو بجائے خود مسلم حکومتوں کی ترقی کی بنیاد تھا۔ قیمت تین روپیہ، علاوہ محصول

جنوری، فروری ۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہلِ قلم کے شامل کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہئے

قیمت دو روپیہ - علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرت اشتہار

ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ ۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھ صفحہ ۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ ۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر چھ روپیہ - ششماہی جاری نہیں ہو سکتا - سالانہ بیرونِ ہند بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔ "منیجر"

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے۔ "منیجر"

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو